لاہور
تاریخ و تعمیر
رضوان عظیم

لاہور

تاریخ و تعمیر

رضوان عظیم

اعزازی ایسوسی ایٹ۔ نیشنل کالج آف آرٹس

جُمہوری پبلیکیشنز

Independent & Progressive Books

• نام کتاب - لاہور - تاریخ و تعمیر • مصنف - رضوان عظیم

• سرورق - ایڈون لارڈ ویکس کی مصوری 1860ء

• اشاعت - 2018ء • ناشر - جمہوری پبلیکیشنز لاہور

ISBN:978-969-9739-46-0

قیمت 780/- روپے

درج بالا قیمت صرف اندرونِ پاکستان

اہتمام: فرخ سہیل گوئندی

Lahore-Tareekh-o-Tameer

Jumhoori Publications

2 Aiwan-e-Tijarat Road, Lahore-Pakistan

T: +92-42-36314140 +92-42-36283098

Mobile: 0333-4463121

info@jumhooripublications.com

www.jumhooripublications.com

فہرست

متفرقات

ابتدائیہ

''لاہور: تاریخ وتعمیر'' میرے مضامین کا مجموعہ کئی لحاظ سے ایک انوکھی بات ہے۔ پہلے تو یہ کہ انہیں کتابی صورت میں شائع ہوتے ہوتے چالیس سال کا عرصہ لگا۔ دوسرے یہ کہ اس عرصے میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ حالات میں اور خود مجھ میں وہ بظاہر نہایت اہم اور واضح ہیں لیکن حیرت ہے کہ صورت حال کی ماہیت تبدیل نہیں ہوئی۔ نہ لاہور کی سڑکیں اور ماحولیاتی کثافت و آلودگی بدلی ہے اور نہ مضامین لکھنے والے کی طالب علمانہ بے چینی اور شوق صحرا نوردی۔ اس حساب سے یہ فیصلہ غلط نہیں ہوگا کہ انہیں ایک بار پھر باذوق اور باشعور قارئین کے زیر سماعت عدالتی کارروائی کے لیے کتابی صورت میں پیش کردیا جائے۔

مضامین کا پس منظر بیان کرنے کے لیے کچھ تفاصیل لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو شاید میری کوتاہیوں اور غلطیوں کے لیے حفاظتی حصار کا کام دے سکے۔ 1970ء سے 1972ء تک میں نے اس زمانے کے مشہور روزنامہ امروز کی ''قسمت علمی و ادبی'' یعنی سنڈے میگزین میں لاہور کے متعلق یہ مضامین شائع کرانے کی جسارت کی۔ اُس وقت پاکستان ایک سیاسی، ثقافتی وسماجی بحران سے گزر رہا تھا، مشرقی پاکستان کے جدا ہونے کا المیہ اسی عرصے میں وقوع پذیر ہوا۔ ایوب خاں کی جیسی بھی مضبوط آمریت تھی، آخری سانس لے چکی تھی۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور ذوالفقار علی بھٹو کا عروج بھی اسی زمانے میں ہوا۔ ان تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں بظاہر فنی اور تاریخی انداز کے ان مضامین کی جگہ کم ہی نظر آتی ہے لیکن انہی حالات کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ہمیں 1965ء کی کامیابی اور 1971ء کی ناکامی کے درمیان حقیقت پسندی کا راستہ کچھ کچھ نظر آیا تھا اور ایک عزم اور ارادہ حالات کو بہتر کرنے کے لیے نوجوان نسل میں پیدا ہو رہا تھا۔ میں اس وقت نیشنل کالج آف آرٹس میں فن تعمیر کے شعبے کے آخری سالوں میں زیر تعلیم تھا۔ یہ ایسا زمانہ تھا کہ شاکر علی یہاں کے پرنسپل تھے اور بہت سے دانشوران سے ملنے یا ہماری غلط فہمی

کے مطابق ہم سے ملنے کالج کی غیر رسمی فضا میں آتے جاتے تھے۔ کچھ نام مجھے یاد ہیں مثلاً فیض احمد فیض، صفدر میر، انتظار حسین، گورنمنٹ کالج کے ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر تجمل حسین، حنیف رامے، صادقین، عبدالرحمٰن چغتائی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، سید وقار عظیم، ڈاکٹر سید عبداللہ، الغرض لاہور بلکہ پاکستان آنے والے غیر ملکی مصور و دانش ور یہاں وقتاً فوقتاً ہمارے احمقانہ سوالات کا جواب دینے آتے تھے۔ یہ عجیب معاملہ تھا کہ کوئی رکاوٹ یا علمی وفنی لحاظ سے زمین آسمان کا فاصلہ ہمیں کبھی اس محفل دوستاں سے دور نہیں رکھ سکا۔ آج جب میں سوچتا ہوں کہ اس بے تکلفی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے تو صرف یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ لوگ ہی عظیم تھے کہ ہم جیسے نو آموز اور بر خود غلط قسم کے نومشقوں کو پرواز کا طریقہ اسی طرح سکھاتے تھے۔ یہ لوگ خود ہی ہمارے لیے آسانی سے قابل حصول اور قابل دسترس بن جاتے تھے۔ اسی زمانے میں ہمیں ایسے شہرت یافتہ مصوروں اور ہنر مندوں سے کچھ سیکھنے کا موقعہ ملا جو نیشنل کالج آف آرٹس میں پروفیسر شاکر علی کے پہلے پہلے شاگردوں میں شامل تھے اور اب استاد کی حیثیت سے کالج میں پڑھاتے تھے، پھر کچھ دوست اور رہنما ہماری صفوں کے طالب علم تھے یا ایک دو سال آگے تھے۔ اس قبیلے کو ہم شاکر علی کی دی ہوئی اصطلاح میں 'our clan' یعنی ''ہمارا کنبہ'' کہا کرتے تھے ان شخصیات میں محترم نیر علی دادا، احمد خاں، ظہور الاخلاق، عسکری میاں ایرانی، سعید اختر، سلیمہ ہاشمی، کولن ڈیوڈ، میاں صلاح الدین، ڈاکٹر اقبال حسن، مسعود احمد خاں، میاں عبدالمجید، شیریں پاشا، جاوید نجم، دبیر احمد، میاں اعجاز الحسن شامل ہیں اور بہت سے اور بھی نامور ہوں گے جو اس وقت یاد نہیں آرہے اور یہاں ان کا ذکر نہ کرنا ملاقات پر میرے لیے باعث شرمندگی ہوگا۔ بہر حال یہ کہکشاں اس وقت کے نیشنل کالج آف آرٹس کی زینت تھی اور ان کی موجودگی زبان بے زبانی سے ہمیں سوتے جاگتے یہ احساس دلاتی تھی کہ کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی۔ یہ کالج کے مین گیٹ پر سنگ مرمر کی سل پر کندہ ہے وہ اسی لیے تو ہے کہ ہوشیار خبردار کسی کمال کے بغیر ہی یہاں سے رخصت ہو گئے تو تمہاری داستان بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔ اب کمال فن حاصل کرنا تو بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ بقول اقبال ؎

معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

اپنے سامنے بلند پایہ اور قد آور ماہرین فن کو دیکھ کر خوف آتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم کیا کھا کر ان کے برابر ہوں گے۔ آگے نکلنا تو بعید از قیاس بات ہے۔ میری ایک خوش نصیبی یہ سمجھئے کہ خاندانی طور پر ادبی و علمی ماحول سے وابستہ تھا۔ نقوش، ادبی دنیا، لیل و نہار وغیرہ جیسے ادبی اور معلوماتی پرچے

پڑھتے پڑھتے کالج تک پہنچے تھے۔ احسان دانش صاحب کی کتاب ''جہاں دگر'' میں ان کی غریب پروری کے سبب اس خاکسار کا ذکر ''مصوروں اور فنکاروں'' کے باب میں آیا اور انہی باتوں سے یہ خیال دماغ میں سمایا کہ اردو میں فن تعمیر پر بہت کم لکھا گیا ہے اور کوئی اس میدان میں ہے بھی نہیں۔ (حالانکہ اس وقت ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور ولی اللہ خاں صاحب مستقل مضامین لکھ رہے تھے) چنانچہ فن تعمیر کا ماہر بننے سے پہلے پہلے ہمیں اپنے آپ کو ایک مضمون نگار کی حیثیت سے متعارف کرالینا چاہیے۔ یہ مضامین جیسا کہ پہلے عرض کیا، امروز اور پھر سیارہ ڈائجسٹ، ماہنامہ عین اور اسی قبیل کے دوسرے اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے۔ مضامین پسند کیے گئے، معاوضہ بھی ملا، اور بہت سے قارئین نے مزید معلومات کے لیے خط وکتابت کی۔ یہ سلسلہ کوئی دو تین سال چلتا رہا اور اسی دوران ہم نیشنل کالج آف آرٹس سے امتیازی حیثیت میں کامیاب ہوگئے۔ کھانے کمانے کی تگ ودو شروع ہوئی اور آنکھ کھلی تو تیس سال گزر چکے تھے۔

کئی بار ان اخباری تراشوں کو لے کر بیٹھے لیکن طبیعت مزید کام پر آمادہ نہ ہوئی۔ انہیں ایک جگہ رکھنے کی قیمت یہ تھی کہ پاکستان سے باہر دس سالہ خانہ بدوشی میں بھی یہ ''اسباب خانہ'' کے ساتھ منتقل ہوتے رہے اور ہوائی کمپنیوں کو تھوڑا بہت مالی فائدہ پہنچاتے رہے۔ ہمارے دوستوں اور مخلص ساتھیوں نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی کہ یہ مرحلہ آسان ہو جائے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ احساس شدید ہوتا گیا کہ یہ مضامین ہماری پہچان بن جائیں گے۔ اور زمانہ طالب علمی میں لکھے ہوئے یہ کچے پکے مضامین متروک اور کرم آلود کتابوں کی زینت تو ہو سکتے تھے، آج کے حالات میں ان کی حیثیت کیا ہوگی؟ ان کی تاریخی اہمیت 1970ء کی دہائی کے واقعات کے لیے ایک حوالہ کی کتاب میں تو ہو سکتی تھی لیکن ان کے موجودہ زمانے میں قابل قبول ہونے کے لیے ازسرنو معلومات کو اکٹھا کرنا اور ترتیب دینا ضروری تھا۔ اپنی کم مائیگی کا احساس تھا، اب مصروفیات ایسی بڑھ چکی ہیں کہ ان عنوانات پر لکھنا اور سنجیدگی سے لکھنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اپنی پہچان کے لیے ایک اچھی اور عمدہ کتاب لکھنے کے لیے یہ منصوبہ ملتوی ہوتا رہا۔

داد دینی پڑتی ہے اپنے نوجوان ساتھیوں کو جو کبھی ہمارے طالب علم بھی رہے ہیں یا ان کے طالب علم ہیں جو کبھی ہمارے ساتھ تھے کہ نہ صرف انہوں نے خود بہت خوبصورت کتابیں لکھی ہیں اور شائع کرائی ہیں بلکہ کمال چابکدستی سے میرے مسودے کو بھی کمپوزنگ کے لیے اڑا لیا اور جب آدھا کام ہو ہی گیا تو ہم نے سوچا اسے ''یاد ماضی'' کے طور پر آپ سب کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ شاید کچھ عاقبت

سنور جائے اور وہ ''عظیم کتاب، جو پہچان بن جائے'' کے لیے مجھے چاہیے، آپ کی محبت سے معرض وجود میں آ ہی جائے۔

میرے شکریے کے مستحق ہیں عزیزان ڈاکٹر عبدالرحمٰن، پروفیسر سجاد کوثر، ڈاکٹر شاہد رضوی، آرکی ٹیکٹ عقیل عباس جعفری اور سب سے بڑھ کر آرکی ٹیکٹ غافر شہزاد یہ سب ماشاءاللہ صاحب قلم اور صاحب فن ہیں اور کئی فنی و ادبی کتابوں کے مصنف بھی۔ میری دعائیں اپنے طالب علموں کے لیے اس نصیحت کے ساتھ رہیں گی کہ اگر لکھنا ہے تو فوراً لکھو اور چالیس سال کا انتظار کیے بغیر شائع کرادو۔

رضوان عظیم

جولائی 2012ء

لاہور: فنِ تعمیر،
شہری منصوبہ بندی، تاریخ

مسجد دائی انگہ

لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر 1 کی دیوار کے ساتھ باہر کی جانب ایک پرانی مسجد ہے۔ یہ مسجد آج کل ریلوے کی عمارات میں گھری ہوئی ہے اور اس جگہ تک پہنچنے کے لئے ریکس سینما سے آگے میورو ڈ (علامہ اقبال روڈ) پار کرنے کے بعد کوئی نصف فرلانگ چلنا پڑتا ہے۔ یہ مسجد دائی انگہ کے نام سے منسوب ہے۔ اسے شاہ جہان کے عہد میں دائی انگہ نے 1045ھ (1635ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ دائی انگہ جہانگیر کے دولت خانہ میں رہتی تھی اور اس نے شاہ جہان کو دودھ پلایا تھا۔ دائی انگہ کے نام کے متعلق لکھا گیا ہے کہ انگ جسم کو کہتے ہیں اور انگہ اس دایہ کو جو شہزادوں کو دودھ پلاتی تھی۔ اس دائی انگہ کا اصلی نام زیب النساء بیگم تھا اور اس کا خاوند مراد خاں جہانگیر کے عہد میں بیکانیر کا مجسٹریٹ یا عدالتی تھا۔ دائی انگہ کو قدرت نے عزت اور دولت سے نوازا تھا۔ شاہ جہان اسے نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ دائی انگہ نے ایام ضعیفی میں بادشاہ سے حج پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ شاہ جہان نے اس سفر کے تمام انتظامات خود کیے۔ دائی انگہ نے ہندوستان چھوڑنے سے پہلے اپنی دولت کو ایک مسجد کی تعمیر کے لئے وقف کر دیا۔ یہ مسجد دائی انگہ کی نگرانی میں مکمل ہوئی۔ دور شاہ جہانی کے شہرہ آفاق معماروں اور کاشی کاروں نے اسے ایک فن پارے کا روپ دیا۔ مغل دور کی دیگر مساجد کی طرح مسجد دائی انگہ ایک مسقّف ایوان اور اس کے سامنے کھلے صحن پر مشتمل ہے۔ مسجد میں داخل ہونے کے لیے موجودہ راستہ صحن سے ملے ہوئے تالاب کے سامنے ہے جو جنوب کی طرف ہے۔ مسجد کا صدر دروازہ غالباً مسجد کے عین سامنے ہوگا لیکن آج اس کے آثار نہیں ملتے۔ مسجد مغلیہ دور کے مخصوص طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔ عمارت پختہ اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔ تین مدور گنبد اس کے مسقّف پر قائم ہیں۔ پتا چلتا ہے کہ اس مسجد کے چار مینار بھی تھے جو تین تین منزلہ تھے۔ اب صرف اگلے دو مینار برائے نام باقی رہ گئے ہیں۔ مسجد کی تین محرابیں ہیں درمیان والی محراب بڑی ہے اور دائیں بائیں چھوٹی محرابیں ہیں جن کی مناسبت سے دائیں اور بائیں گنبد بھی درمیانی

گنبد سے قدرے چھوٹے ہیں۔ بڑی محراب کی پیشانی پر ''اللہ۔محمد۔ابوبکرؓ۔عمرؓ۔عثمانؓ۔علیؓ۔حسنؓ۔حسینؓ'' تحریر ہیں۔ اسی محراب پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ بھی تحریر ہے۔ بائیں محراب کے اندر دو چھوٹی چھوٹی سنگ مرمر کی چوکور تختیوں پر کتبہ تاریخ ہے۔ ''کتبہ ابراہیم سن 1045ھ اور با اعتماد خود مقبول با تمام رسیدہ۔''

عمارت کا سب سے خوبصورت اور فنی لحاظ سے نہایت اہم پہلو کاشی کاری ہے۔ یہ مسجد اندر اور باہر سے کاشی کاری کے نادر نمونوں سے مزین ہے۔ مغلیہ دور میں خصوصاً شاہ جہان کے عہد میں یہ فن اپنے عروج پر تھا۔ کاشی کاری روغنی ٹائلوں کے ٹکڑوں سے بیل بوٹے بنانے کا نہایت پیچیدہ اور خوبصورت کام ہے۔ ایران میں نیلی ٹائل عمارت کی زیب وزیبائش کے لئے کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ سندھ کی قدیم عمارات میں بھی اس کے نمونے ملتے ہیں لیکن رنگارنگ چمکدار ٹائلوں سے بیل بوٹے کی یہ بوقلمونی اور کہیں نہیں ملتی۔ قلعہ لاہور میں مختلف رنگوں کے پتھروں سے بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ وہیں ہمیں کاشی کاری کے اعلیٰ نمونے بھی ملتے ہیں۔ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کاشی کاری دراصل پتھر کے بیل بوٹے بنانے کا ایک نعم البدل ہے۔ لاہور میدانی علاقہ ہے۔ طرح طرح کے رنگدار پتھر دور دراز سے لائے جاتے تھے۔ پھر کاشی کاری میں نہایت واضح اور شوخ رنگ بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ سنگی کندہ کاری کے بجائے کاشی کاری کو رواج دیا گیا جبکہ ان دونوں کے استعمال اور عمارت میں نصب کرنے کے طریقے میں کوئی فرق نہیں۔ یہاں تک کہ بیل بوٹوں کی ترتیب بھی کم و بیش یکساں ہے۔ مسجد دائی انگہ میں کاشی کاری نہایت اعلیٰ درجے کی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس فن کے مکمل اظہار کے لئے اس مسجد کو تعمیر کیا گیا ہے۔ بڑی محراب میں بسنتی رنگ کا ایک حاشیہ ہے جس پر آیات قرآنی تحریر ہیں۔ چھوٹی محرابوں میں نیلے حاشیے میں قرآن پاک کی آیات اور درود شریف خط نسخ میں تحریر ہے۔ تمام دیواریں چوکھٹوں میں گھری ہیں جو کاشی کاری کے ذریعے سجائے گئے ہیں۔ مسجد کے اندر بھی کچھ کاشی کاری کی گئی ہے۔ مسجد کا صحن دوبارہ بنایا گیا ہے۔ دائیں جانب کچھ نئی تعمیر بھی ہوئی ہے۔ مسجد کے بائیں جانب صحن میں وضو کا ایک تالاب ہے، جو ابھی تک کارآمد ہے۔ یہ مسجد مغلیہ دور حکومت میں نہایت بارونق تھی۔ لاہور اس زمانے میں ایک نہایت وسیع اور آباد شہر تھا۔ اس کو چھتیس (36) گذروں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر گذر کئی محلوں پر مشتمل تھا۔ کل نو گذر فصیل شہر کے اندر تھے۔ باقی ستائیس اس سے باہر تھے اور مسلسل پھیل رہے تھے۔

اس زمانے میں سپین کا ایک پادری آگرہ سے ہوتا ہوا لاہور پہنچا۔ وہ لکھتا ہے: ''مغلیہ سلطنت

کا دوسرا بڑا شہر لاہور نظر آیا جس کی آبادی اس قدر ہے کہ شہر سے باہر ڈیڑھ میل تک خوبصورت عمارات اور خیموں میں پھیلی ہوئی ہے۔'' لاہور کی رونق اور آبادی کے پس منظر میں یہ تصور کرنا آسان ہے کہ محلّہ دائی انگہ جہاں یہ مسجد واقع تھی، نہایت آباد علاقہ تھا بہت سی جائیداد اس مسجد کے لئے وقف کی گئی تھی اور اس کی مناسب نگہداشت کی جاتی تھی۔

مغل حکومت کے ختم ہوتے ہی دوسری عالی شان عمارتوں کے ساتھ ساتھ اس مسجد کے بھی بُرے دن آئے سکھوں کی دست اندازیاں شروع ہوئیں اور غارت گروں نے شہر لوٹ لیا۔ شہر پناہ سے باہر کی آبادی ویران ہوئی اور یہ مسجد شکستہ حالت میں باقی رہ گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں اسے بارود خانہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ ہنری کوپ نے جو لاہور کرانیکل کا ایڈیٹر اور پرسنل منیجر تھا، اس مسجد کو حکومت کی اجازت سے اپنی رہائش کے لئے استعمال کیا۔ چند سال بعد ہنری کوپ نے اس مسجد کو پنجاب کمپنی کے ہاتھوں بارہ ہزار روپے میں فروخت کر دیا۔ جب یہ کمپنی سرکاری تحویل میں آئی تو اسے ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کے دفتر کے لئے استعمال کیا گیا۔ منشی محمد الدین فوق مرحوم نے نومبر 1901ء میں اپنے اخبار ''پنجہ فولاد'' کے ذریعے مسجد کے غلط استعمال کے خلاف تحریک چلائی۔ بالآخر لارڈ کرزن نے 1903ء میں مسلمانوں کو مسجد کے طور پر اسے استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ اس وقت سے آج تک یہ مسجد نمازیوں سے آباد ہے۔

لاہور کی دیگر تاریخی مساجد کی طرح مسجد دائی انگہ بھی ایک بڑے خطرے سے دوچار ہے۔ یہ مسجد تاریخی اہمیت کی بنا پر محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں ہے۔ عمارت کی خستہ حالی کے پیش نظر اسے استعمال کرنے والے فکر مند ہیں لیکن سرکاری دفاتر کی غیر ضروری پیچیدگیاں مرمت اور دیکھ بھال کو ایک عرصے سے التوا میں ڈالے ہوئے ہیں۔ ایک چھوٹا سا بورڈ جو ایک کونے میں نصب کر دیا گیا ہے، اس بات کا ثبوت ہے کہ محکمہ آثار قدیمہ اس مسجد کی نگرانی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی چیز ایسی نہیں جس سے محکمے کی موجودگی کا سراغ ملے۔ راقم الحروف کو چند دن پہلے (1970ء) مسجد کا تفصیل سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ مسجد مجموعی طور پر مخدوش حالت میں ہے۔ گنبد کے اندرونی حصے کا استر گر چکا ہے اور اکثر و بیشتر مٹی اور اینٹوں کے ریزے نیچے گرتے رہتے ہیں۔ مسجد کا دایاں حصہ نہایت خستہ حالت میں ہے اور کاشی کاری کا کام بڑی حد تک ختم ہو چکا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے درمیانی اور بائیں حصے پر یہ کام نہایت خوبصورتی سے قائم تھا لیکن اس کی مرمت اور دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اس مسجد کی دلکشی ختم ہونے کو ہے۔ اہل محلّہ

نے کاشی کاری کے اس اعلیٰ کام کو پرانا اور دھندلا تصور کرتے ہوئے دو پینٹر بلوائے تھے جنہوں نے اس وقت مسجد کے ایک تہائی حصے پر بنے ہوئے نقش ونگار سائن بورڈ بنانے والے شوخ کیمیائی رنگوں سے دوبارہ بنا دیئے ہیں۔ چنانچہ اب تک مسجد کا شاید ہی کوئی حصہ ایسا بچا ہو جسے دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ یہ مسجد کبھی کاشی کاری کے اعلیٰ نمونوں سے مزین تھی۔ یہی عالم گنبدوں کا ہے۔ یہ کبھی ٹائلوں سے سجائے گئے ہوں گے۔ اب ان پر اس انداز سے سیمنٹ پلستر کیا گیا ہے کہ گنبد کی اصل صورت معدوم ہو گئی ہے۔ گنبد کی بیرونی سطح پر سبز روغن کر دیا گیا ہے۔

یہ عمارت تاریخی نوادرات میں شامل ہے لیکن اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ مسجد کی نئی زیبائش وآرائش شروع کرتے وقت کسی کو خیال نہ آیا کہ اس کے لئے فنی اور پیشہ ورانہ معلومات کی ضرورت ہے۔ کاشی کاری ایک معدوم فن ہے اور یہ لاہور کی تاریخی عمارات کا ایک خاص پہلو رہا ہے۔ اس طرز زیبائش کی بہت کم عمارات باقی رہ گئی ہیں اور مسجد دائی انگہ جو منفرد اہمیت کی حامل ہے اور لاہور کے وسطی علاقے سے نزدیک ترین مقام پر واقع ہے، اس قابل ہے کہ اس کی تزئین ایسے خطوط پر کی جائے جو اس مسجد کو لاہور کے لیے ایک قابل فخر اور قابل دید تاریخی ورثہ بنا سکے۔

O

مسجد محمد صالح

لاہور کی تاریخی مساجد میں موچی دروازے کے نزدیک واقع مسجد محمد صالح کمبوہ خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مسجد شاہجہاں کے عہد کی یادگار ہے۔ شیخ محمد صالح کمبوہ صوبہ پنجاب کے ممتاز امراء میں سے ایک تھا۔ عدالتی اور درباری زندگی میں اس کا خاصا عمل دخل رہا۔ اس نے کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ''عمل صالح'' شاہ جہان کے عہد حکومت کی تاریخ ہے، اسی طرح محمد صالح کے بھائی شیخ عنایت اللہ نے مایہ ناز بہار دانش تصنیف کی۔ چنانچہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ کمبوہ خاندان اس وقت علم و فضل اور عزت و امارات میں لاہور کے ممتاز گھرانوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ موچی دروازے سے متصل اس خاندان کی حویلیاں انگریزوں کے عہد تک قائم رہیں اور یہ مسجد انہی حویلیوں کے ساتھ تعمیر کی گئی تھی۔ محمد صالح نے اپنی حویلی کے مغربی جانب یہ مسجد تعمیر کرائی۔ شاہ جہانی عہد کی دیگر مساجد کی طرح یہ مسجد بھی کاشی کاری کے اعلیٰ نمونوں سے مزین ہے۔ اس وقت مسجد محمد صالح بازار کی سطح سے کوئی چھ فٹ بلند کرسی پر واقع ہے اور صحن مسجد تک پہنچنے کے لئے ایک چھوٹے سے دروازے سے گزر کر پانچ سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ اس دروازے پر تین کاشی کار تختیاں نصب ہیں، ان پر شعر درج ہیں:

بانیٔ ایں مسجد زیبا نگار
بندہ آل محمد صالح است

یعنی اس خوبصورت مسجد کی تعمیر کرانے والا صالح ہے جو آلِ نبی کا خادم و غلام ہے۔ ایک اور طاقچے میں سن تعمیر درج ہے، 1070ھ یعنی 1659ء۔ مسجد کا فرش نیا ہے اور از سر نو تعمیر کیا گیا ہے۔ صحن مسجد کے لئے رنگین سیمنٹ کے فرشی ٹائل استعمال کیے گئے ہیں۔ ایوان مسجد میں کہیں کہیں پتھر کا اصلی فرش باقی رہ گیا ہے۔ اس چھوٹی سی مسجد میں کاشی کاری کے اچھے نمونے پائے جاتے ہیں۔ مسجد کی تین محرابیں ہیں

جن کے اوپر اور دائیں بائیں زرد اور نیلے رنگ کی کاشی کاری ہے۔ ان میں آیات قرآنی اور احادیث فارسی نسخ اور نستعلیق خط میں تحریر ہیں۔ مسجد کی دیواروں پر درج کردہ فارسی اشعار ادبی لحاظ سے بلند پایہ ہیں۔ دیواروں کو خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔ تین مدور گنبد عمارت پر قائم ہیں۔ ان کی اندرونی سطح شاہی مسجد کے گنبدوں کی طرح رنگ وروغن سے بنائے گئے بیل بوٹوں سے مزین ہے۔ ایوان مسجد کے دائیں اور بائیں جانب دو چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں جو وضو خانے اور امام مسجد کی آرام گاہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ بازار کے فرش سے مسجد کی بلندی کی وجہ یہ ہے کہ مسجد کا صحن اور ایوان نیچے واقع دکانوں پر تعمیر ہوا تھا۔ یہ دکانیں اب نصف سے زیادہ زیرزمین نظر آتی ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مسجد کی بیشتر کاشی کاری معدوم ہو چکی ہے۔ عمارت کی بیشتر سطح پر چونا پھیر دیا گیا ہے جس سے کاشی کاری کا اندازہ مشکل ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔

موجودہ دور میں گنبدوں کے حقیقی رنگ وروپ کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے مسجد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ موچی دروازے سے شہر میں داخل ہونے والے نووارد کو سب سے پہلے یہی عمارت نظر آتی ہے اور ارد گرد کے نظری ماحول میں اسے واضح اہمیت حاصل ہے۔ مسجد کا چھوٹا سا دروازہ شہر میں داخل ہونے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور مسجد کے معمار نے مختصر اور تنگ جگہ میں یہ تاثر تخلیق کر کے ایک کامیاب تجربہ کیا۔ یہ تاثر آج بھی کارآمد ہے۔ معمار نے اونچائی، سمتوں کے تعین اور زیبائش سے یہ مقصد حاصل کیا ہے۔ مسجد کی غیر معمولی ترتیب اس لیے بھی قابل ستائش ہے کہ کعبے کے رخ اور پانی کی بہم رسانی ونکاسی کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔ انہی سب خوبیوں کی بنا پر ہم اس مسجد کو لاہور میں فن تعمیر و ماحول سازی کا ایک عمدہ نمونہ کہہ سکتے ہیں۔

○

چوبرجی اور مقبرہ ''زیب النساء''

نواں کوٹ میں ملتان روڈ کے کنارے ایک قدیم مقبرہ ہے، عام طور پر اسے مقبرہ زیب النساء کہا جاتا ہے۔ آج (1970ء) سے کوئی دس بارہ سال پہلے اس مقبرہ کے اردگرد کچھ پرانی تعمیرات بھی تھیں لیکن اب وہ نظر نہیں آتیں اور نئے مکانات تعمیر ہو گئے ہیں۔ نواں کوٹ مغلوں کے عہد میں آباد ہوا۔ سکھ دور میں اسے خاصی اہمیت حاصل رہی اور محلے کے گرد دیوار بھی قائم کی گئی۔ آج کل اس دیوار کے آثار کہیں کہیں ملتے ہیں۔ نواں کوٹ کی پر پیچ اور گنجان آبادی کے درمیان ایک خوبصورت دروازہ اور دو برج بھی خستہ حالت میں موجود ہیں۔ فن تعمیر کے لحاظ سے نواں کوٹ کی ان تاریخی عمارات کو چند نایاب نمونوں کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ لاہور کی قدیم تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ نواں کوٹ کی عمارات دراصل ایک مغل باغ کی زمین پر تعمیر ہوئی ہیں اور یہ دروازہ اس باغ میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ ملتان روڈ پر واقع مقبرہ بھی اسی باغ کے اندر تعمیر کیا گیا تھا۔ صاحب مقبرہ کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ بات یقینی نہیں ہے کہ اس مقبرہ میں زیب النساء دفن ہے۔ چوبرجی کے متعلق بھی متضاد بیانات موجود ہیں۔

سید محمد لطیف نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے کہ ملتان روڈ کے مغرب میں واقع عمارت جسے چوبرجی کہتے ہیں اورنگ زیب کی عالم و فاضل بیٹی زیب النساء یا زیبندہ بیگم کے باغ کا دروازہ ہے۔ اس کا تخلص مخفی یا ''باپردہ'' تھا۔ بیرونی دیوار چمک دار روغنی ٹائلوں سے سجائی گئی تھی، جو ڈھائی سو سال گزرنے کے باوجود ابھی تک ترو تازہ محسوس ہوتی ہے۔ یہ باغ دراصل نواں کوٹ سے لاہور کے پرانے شہر تک پھیلا ہوا تھا لیکن اب کوئی آثار موجود نہیں۔ اسی طرح تحقیقات چشتی کے مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ چوبرجی زیب النساء کی تعمیر کردہ ہے اور نواں کوٹ میں واقع دیگر عمارات بھی اسی سے تعلق رکھتی ہیں۔ چوبرجی اور مقبرہ زیب النساء ایک دوسرے سے نسبتاً قریب واقع ہیں اور ان کے متعلق ماضی میں بہت سی غلط حکایات مشہور ہوتی چلی آئی ہیں۔ دور جدید کے لکھنے والوں میں سے اکثر نے یہ غلطی

کی ہے اوران عمارات کو زیب النساء سے منسوب کیا ہے چنانچہ رائے بہادر کنہیالال ایگزیکٹو انجینئر کی تاریخ لاہور میں بھی اس غلط فہمی کا اعادہ کیا گیا۔ سید محمد لطیف اور مولوی نور احمد چشتی کے بیان کردہ افسانے میں بڑی مماثلت ہے۔ شاید اول الذکر نے پہلے لکھی ہوئی کہانی کو صحیح سمجھ کر نقل کیا ہے۔ تحقیقات چشتی میں چوبرجی کا ذکر یوں کیا گیا ہے کہ چوبرجی کے مغربی دروازے پر نقش شدہ شعر:

ساخت میاں بائی فخر النساء

روضہ عالی ارم احتشام

سے میابائی کنیز کا پتہ چلتا ہے جو اورنگ زیب عالمگیر کی عالم وفاضل بیٹی زیب النساء کی خاص مصاحب تھی۔ اسی کی زیرنگرانی زیب النساء نے لاہور میں ایک باغ تعمیر کرایا۔ چوبرجی ایک تاریخی باغ کی ڈیوڑھی تھی۔ یہ باغ اپنی وسعت اور خوبصورتی کی وجہ سے لاہور میں شالامار باغ کے بعد دوسرے درجے پر شمار کیا جاتا تھا۔ چند مورخین نے اس کی حدود کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا کہ یہ باغ نواں کوٹ اور میانی صاحب سے لے کر مزار داتا گنج بخش ہجویریؒ اور پیر مکیؒ تک پھیلا ہوا تھا یعنی لاہور اور دریائے راوی کے درمیان تمام علاقہ اسی باغ میں شامل تھا۔ دریا کے سیلابوں نے باغ کو بہت نقصان پہنچایا اور یہ دروازہ اسی باغ کی آخری نشانی کے طور پر موجود رہا۔ تحقیقات چشتی کے زمانہ تالیف یعنی 1864ء کے لگ بھگ اس باغ کی چاردیواری کے ٹوٹے پھوٹے آثار پائے جاتے تھے۔ بہرحال چوبرجی کے متعلق یہ کہانی مشہور ہے کہ باغ تعمیر ہونے پر زیب النساء نے اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، راستے میں لوگوں کو کہتے سنا کہ شہزادی اپنی کنیز میابائی کا باغ دیکھنے جارہی ہے۔ ذہین وفطین شہزادی نے جب یہ سنا تو سوچا کہ یہ باغ اب میابائی کے نام سے مشہور ہو گیا ہے، مزاج شاہی کا تقاضہ یہی ہے کہ اسی کو بخش دیا جائے۔ میابائی نے بھی شہزادی سے ملاقات پر اسے درازی عمر کی دعائیں دیں۔ یہ ایک اشارہ تھا جو شہزادی نے سمجھ لیا۔ وہ پہلے ہی ارادہ کر چکی تھی کہ یہ باغ میابائی ہی کے تصرف میں رہے گا چنانچہ وہ اس وقت تک دروازے سے آگے نہیں گئی جب تک کہ یہ اعلان نہ کرادیا کہ شہزادی نے میابائی کی قابلیت اور کام سے خوش ہو کر یہ باغ اسے عنایت کر دیا ہے۔ سید محمد لطیف نے شاہ جہاں نامہ کے مصنف سرغام الدولہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب زیب النساء نے یہ باغ اپنی کھلائی کو بخش دیا تو اپنے لیے نواں کوٹ میں ایک باغ تعمیر کرایا جو بعد میں باغ زیب النساء یا باغ زیبندہ بیگم کے نام سے مشہور ہوا۔

چو برجی دراصل ایک مغل باغ کا دروازہ ہے۔عمارت دومنزلہ ہے لیکن باہر سے یہ معلوم نہیں ہوتا۔ڈیوڑھی پر گنبد ہے اور چاروں کونوں پر ہشت پہلو مینار بنائے گئے ہیں۔آج کل (1970ء) ان میناروں میں صرف تین باقی بچے ہیں اوران پر چھتریاں بھی موجود نہیں ہیں۔بہر حال عمارت آج بھی چو برجی کہلاتی ہے۔تمام عمارت کو رنگین روغنی ٹائلوں سے سجایا گیا ہے۔نیلے، زرد اور سبز رنگ کے مختلف انداز یہاں پائے جاتے ہیں۔اسلامی فن تعمیر کے مایہ ناز محقق ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کے مطابق نیلے رنگ کا ایک نیا انداز جو دروازے کے اوپر دو تختیوں میں استعمال ہوا ہے، اپنی قسم کی منفرد چیز ہے اور ابھی تک انہوں نے ایسا پاکیزہ رنگ کسی اور جگہ نہیں دیکھا۔ٹائلوں سے نہایت دلفریب نقش ونگار بنائے گئے ہیں۔کاشی کاری کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔آج اس عمارت کو بنے ساڑھے تین سو سال (1970ء) ہونے کو آئے لیکن ابھی کاشی کاری کا روپ تروتازہ ہے۔نقاشی عمدگی اور سلیقے سے کی گئی ہے۔تمام عمارتی زیبائش میں تناسب ہے۔عمارت کا بوسیدہ حصہ زبوں حالی کا شکار ہے۔بیشتر مقامات پر کاشی کاری ضائع ہوتی جارہی ہے البتہ سامنے کا حصہ ابھی اچھی حالت میں ہے۔اس شکست ور یخت سے گزرنے کے باوجود اس عمارت کی فنی قدروقیمت اور دلکشی میں کوئی فرق نہیں آیا اور یہ عمارت اپنی خوبصورتی پر نازاں ہے۔اس عمارت کے عقب میں تمام نشیبی حصہ کاشتکاری کے لیے استعمال ہوتا رہا۔لیکن آج وہاں گنجان آبادی ہے۔پونچھ ہاؤس بھی اسی عمارت کے گردونواح میں ہے۔پونچھ ہاؤس کا بنگلہ پہلے پہل 1849ء میں لارڈ لارنس کی رہائش کے لئے تعمیر ہوا تھا۔اس وقت پنجاب پر سکھوں کی حکومت تھی اور مہاراجہ دلیپ سنگھ کی حکومت تھی اور لارڈ لارنس پنجاب کی خودسر خالصہ فوج کی بیخ کنی کے لئے گورا فوج کے ساتھ لاہور آیا تھا۔لارڈ لارنس کے بعد یہ بنگلہ چارلس بولنوائس کے قبضے میں رہا۔یہ چیف کورٹ پنجاب کے پہلے بیرسٹر تھے۔بعد میں یہ سرمیرڈتھ پلوڈن کے تصرف میں رہا جو چیف کورٹ کے چیف جج تھے۔اس باغ میں احاطے میں میابائی کا مقبرہ بھی موجود تھا جو سکھوں کے عہد میں مسمار کردیا گیا۔

باغ زیبندہ بیگم اوراس کے دروازے چو برجی کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں ان کی زیادہ تر ذمہ داری سید محمد لطیف پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے زیب النساء اور زیبندہ بیگم کو ایک ہی شخصیت کے دومختلف نام سمجھ لیا۔چو برجی کے اوپر آیت الکرسی تحریر ہے۔اسی خطاطی میں نیلے رنگ کے روغنی ٹائل استعمال کیے گئے ہیں۔آیت الکرسی کے بعد تاریخ تکمیل بھی درج ہے یعنی 1056ھ۔عیسوی سن کے اعتبار سے یہ عمارت 1644ء میں تعمیر ہوئی۔درمیانی محراب کے اوپر مندرجہ ذیل اشعار درج ہیں:

بفضل قادر و قیوم و خالق دوراں
بنا پذیر کند این باغ روضہ رضواں
بکشت مرحمت این باغ بر میابائی
زلطف صاحب زبندہ بیگم دوراں

پہلے شعر کا پہلا مصرعہ اب مٹ چکا ہے لیکن ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے تاریخی حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ پہلا مصرعہ یہی تھا۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے جو قادر وقیوم اور زمانے کو پیدا کرنے والا ہے، جنت کے نمونے والا یہ باغ تکمیل پذیر ہوا اور زمانے کو زیبائش دینے والی بیگم صاحب نے ازراہ لطف وکرم یہ باغ میابائی کو مرحمت فرمادیا۔

درمیانی محراب کے دونوں طرف گول تختوں کے درمیان نیلے رنگ کی کاشی کے ذریعے اللہ لکھا گیا۔ عمارت کے اوپر گنبد اب بوسیدہ ہو گیا ہے اور خاصا حصہ گر چکا ہے (1970ء)۔

محکمہ آثار قدیمہ کی طرف سے جو تختی عمارت کی دیوار پر نصب کی گئی تھی، اس پر ''زبندہ بیگم'' لکھا ہے۔ مذکورہ بالا اشعار میں ''زبندہ'' کے معنی غلط نکالے گئے ہیں۔ یہ لفظ کسی مغل شہزادی یا حرم کا نام نہیں ہے بلکہ ''زبندہ بیگم دوراں'' سے مراد ملکہ وقت اور آرائش وزیبائش بہم پہنچانے والی شخصیت ہے۔ زیب النساء اور زبندہ کی لفظی مشابہت بہت سے مورخین کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہے چنانچہ شاہ جہاں نامہ ''ہسٹری آف لاہور''، تحقیقات چشتی، تاریخ لاہور، ایجوکیشن ان مسلم انڈیا اور دیگر کتابوں میں بھی زبندہ کو کسی مغل شہزادی خصوصاً زیب النساء کا نام سمجھا گیا ہے جو رعایت شعری سے تبدیل کر لیا گیا ہے۔ پروفیسر علم الدین سالک نے اپنی کتاب ''دختران ہند'' میں ثابت کیا ہے کہ زیب النساء کا اس عمارت اور باغ کی تعمیر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ صوفی احمد وحید اختر نے بھی اس خیال کی تائید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ زیب النساء کی تاریخ پیدائش اور اس عمارت کی تاریخ میں کوئی مطابقت نہیں ہے۔ زیب النساء کی تاریخ پیدائش کے بارے میں دو ماخذ ہیں۔ ملا عبدالحمید لاہوری کی کتاب ''بادشاہ نامہ'' جس میں لکھا گیا ہے کہ زیب النساء 1047ھ میں پیدا ہوئی۔ ماثر عالمگیری میں جو بادشاہ نامہ کے بعد لکھی گئی ایک مختلف تاریخ ملتی ہے۔ اس کتاب کا مصنف ساقی لکھتا ہے:

''زیب النساء آن ثمرہ طیبہ نہالِ حشمت و اقبال دہم شوال سال ہزار و چہل و ہشت (1040ھ) از بطن بیگم بدولت سرائے دینوی قدم گذاشت بودند۔''

اور ایک مورخ مرزا مہدی شیرازی نے ماثر عالمگیری پر یقین کرتے ہوئے لکھا ہے:

''زیب النساء از بطن دل رس بانو دختر شاہنواز خان 1048ء بوجود آمد حافظ قرآن بود فود صرف وقفہ را نجوی آموختہ بود و شوہر اختیار نکرد و در 1112ھ وفات یاقت''۔(تذکرۃ الخواتین)

ملا عبدالحمید لاہوری کی تاریخ کو مستند خیال کیا جائے جو زیادہ قابل اعتماد ہے تو زیب النساء 20 شوال 1047ء کو پیدا ہوئی جبکہ چوبرجی پر تاریخ تعمیر 1056ھ (1637ء) درج ہے۔اس لحاظ سے زیب النساء کی عمر اس وقت آٹھ نو سال ہو گی۔اتنی چھوٹی بچی کے لئے یہ کتنا مشکل نظر آتا ہے کہ وہ ایک خوب صورت اور وسیع باغ تیار کرانے کے منصوبہ بنائے گی اور اس کا خرچ برداشت کرے گی۔اس کے بعد اپنی کنیز کو تعمیر شدہ باغ بخش دینے کا انداز بھی بڑا مربیانہ اور پختہ ذہنی کا ثبوت ہے جبکہ حالات یہ تھے کہ اس وقت زیب النساء کا باپ اورنگ زیب فقط ایک صوبیدار اور شہزادہ تھا۔اس زمانے میں اورنگ زیب اپنے بڑے بھائی شہزادہ داراشکوہ کی سازشوں اور اثر ورسوخ سے تنگ آ کر اپنے منصب سے مستعفی ہو چکا تھا اور ترک دنیا کے متعلق سوچ رہا تھا۔شاہجہان اس سے ناراض تھا۔دربار میں اسے کوئی رسوخ حاصل نہیں تھا۔اس پر آشوب زمانے میں سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ اپنی بیٹی کی خواہش پوری کرتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ''زیبندہ بیگم'' اور ''میابائی'' کون تھیں جن کے نام چوبرجی پر نقش ہیں۔شاہجہان کی سات بیٹیاں بتائی گئیں ہیں۔ان کے علاوہ کسی اور کا نہ نام آیا ہے اور نہ ہی ان کے وجود کے متعلق کوئی ثبوت ہے۔ان سات شہزادیوں حور النساء، جہاں آراء، روشن آراء، ثریا بانو بیگم، گوہر آرا بیگم وغیرہ میں سے روشن آراء اور جہاں آراء سن بلوغت کو پہنچیں۔باقی شہزادیاں کمسنی میں وفات پا گئیں۔ان دونوں شہزادیوں کے نام تاریخ میں بارہا آئے ہیں لیکن کبھی زیبندہ بیگم کا خطاب نہیں دیا گیا نہ ہی اس نام کی کسی اور خاتون کا نام ملتا ہے۔

چوبرجی کی خوبصورتی اور اس کی فن تعمیر کو جانچنے سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ عمارت دور شاہجہانی کی تمام خصوصیات رکھتی ہے۔ہوسکتا ہے کہ شاہجہان کی سب سے ذہین اور خوش طبع بیٹی جہاں آراء نے یہ باغ تعمیر کرایا ہو۔شاہ جہاں اپنی اس بیٹی کو بہت عزیز رکھتا تھا چنانچہ دور نظر بندی میں بھی یہ شہزادی باپ کے ساتھ رہی اور شاہجہان کی وفات تک اس وفا شعار شہزادی نے بے تاج بادشاہ کا ساتھ

نبھایا۔ شاہ جہان نے اپنی چہیتی بیٹی کو پچاس لاکھ سالانہ کی جاگیر عطا کی تھی اور بے شمار زرو جواہر دے کر اس کی الگ سرکار مقرر کی تھی۔ خاندان تیموریہ میں دستور تھا کہ وہ اپنی حرم کی خواتین کے احترام کے پیش نظر انہیں اصل نام کی بجائے کسی خاص لقب سے پکارتے تھے چنانچہ شاہ جہاں کے وقت کی تاریخوں میں جہاں آراء بیگم کے لیے بیگم صاحب کا لقب دیا گیا ہے۔ جہاں آراء کی بنوائی ہوئی عمارات اور آبادیوں کے نام بھی اسی طریقے سے لیے گئے ہیں مثلاً کشمیر کا قعبہ صاحب یا اجمیر شریف میں بیگمی دالان ابھی تک موجود ہے۔ زیبندہ دوراں فقط شاعرانہ تخیل ہے اور اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ صاحب زیبندہ بیگم دوراں یعنی جہاں آراء بیگم و دختر شہنشاہ نے یہ باغ اپنی کنیز یا کھلائی میا بائی فخر النساء کو عنایت کیا۔

زیب النساء کے متعلق کسی تاریخ میں یہ نہیں لکھا گیا کہ اس نے لاہور میں کوئی باغ تعمیر کرایا۔ شہزادہ داراشکوہ کی کتاب ''سکینۃ الاولیاء'' میں حضرت میاں میرؒ کے ذکر کے ساتھ ان باغوں کی تفصیل بھی ہے جہاں حضرت میاں میرؒ دن کے وقت سیر کو جایا کرتے تھے۔ اس طویل عرصہ میں جہاں آراء کے باغ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی دور کی ایک کتاب ملا محمد صالح کمبوہ کی کتاب ''بہارستان سخن'' میں بھی کسی ایسے باغ کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ چندر بھان برہمن کی مشہور کتاب ''چہار چمن'' میں لاہور کے باغوں کے ناموں میں باغ دلکشا، باغ دلآمیز، باغ مرزا کامران، باغ نولکھا اور باغ شالیمار کے علاوہ ناموس العالم بیگم صاحب جہاں آراء بیگم کے ایک باغ کا ذکر ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر 20 ذی الحجہ 1056ھ (1646ء) کو شاہ جہاں شہنشاہ ہندوستان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے جو اس سے پہلے لاہور پہنچ چکا تھا اسے شہزادہ مراد بخش کی جگہ بلخ اور بدخشاں کا صوبہ دار مقرر کیا۔ اورنگ زیب 15 محرم 1057ھ (1947ء) تک لاہور میں مقیم رہا اور یہاں سے افغانستان روانہ ہوا۔ اس عرصے میں اس نے لاہور کی تفصیلی سیر کی اور تمام باغات وغیرہ دیکھے۔ اس نے ایک رُقعہ بھی لکھا ہے:

''ہم نے کچھ عرصہ سرکار علیا کے باغ کی سیر کی۔ ہماری طبیعت نہایت مسرور ہوئی۔ اس باغ کے تالاب اور عمارات جو ابھی تکمیل کو پہنچی ہیں دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ یہ مقام نہایت عمدہ تفریح گاہ ہے۔ اگر فراست خاں (کوئی مغل امیر جو اس دور میں اہمیت کا مالک تھا) کی عمارت کو گرا کر محل کے طریقے پر نہایت قرینے سے ایک نشیمن بنالیا جائے اور بعض دوسرے تصرفات کر لیے جائیں تو یہ ایک بے نظیر سیر گاہ بن سکتی ہے۔'' یہ وہی زمانہ تھا جبکہ باغ چوبرجی تعمیر ہوا اور اس طرح یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ یہ باغ جہاں آراء کا ہی ہو سکتا ہے۔ محمد عبداللہ قریشی نے اس مسئلے پر خاصی بحث کی ہے اور یہی نتیجہ اخذ

کیا ہے۔اب جبکہ یہ بات طے ہوجاتی ہے کہ چوبرجی اس باغ کا صدر دروازہ ہے جو جہاں آراء نے تعمیر کروایا تھا تو مقبرہ زیب النساء کی حیثیت متعین کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔اس سے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ چوبرجی والا باغ زیب النساء نے اپنی کنیز کو عنایت کرکے اپنے لیے موجودہ نواں کوٹ کے مقام پر باغ تعمیر کرایا جہاں اس کی وفات کے بعد مقبرہ بھی تعمیر ا ہوالیکن باغ اور میا بائی سے زیب النساء کا تعلق نہ رہنے سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ نواں کوٹ والا باغ کس نے تعمیر کرایا اور صاحب مزار کون ہے۔اورنگ زیب کی بڑی بیٹی زیب النساء تھی، اس کی چھوٹی بیٹیوں کے نام بدرالنساء اور مہرالنساء ہیں۔بعض غیر معتبر روایات کی رو سے ایک لڑکی لالہ رخ نام کی بھی تھی۔زیب النساء اپنے زمانہ میں نامور شاعرہ اور عالم فاضل تھی۔اس نے تمام زندگی شادی نہیں کی اور 66 سال کی عمر میں وفات پائی۔زیب النساء کے مقبرے کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔تاریخ میں لکھا ہے کہ زیب النساء قلعہ سلیم گڑھ میں فوت ہوئی جو لال قلعہ دہلی کے ایک حصہ کا نام ہے۔ماثر عالمگیری کا مصنف ساقی لکھتا ہے:

''دارالخلافہ کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ نواب تقدس جناب زیب النساء بیگم اللہ کی رحمت سے پیوست ہوگئیں۔بادشاہ کا دل اس خبر سے بھر آیا، آنکھوں میں آنسو آ گئے۔وہ کمزوری کی وجہ سے بے قرار تھا۔صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔بادشاہ نے سید امجد خاں، شیخ عطاءاللہ، حافظ خاں (جسے تذکرہ چغتائیہ کا مصنف حافظ خان عرف نور محمد لکھتا ہے) کو حکم دیا کہ وہ شہزادی کے نام پر صدقات اور خیرات غریبوں میں تقسیم کریں اور بیگم کا مقبرہ باغ سی ہزاری میں بنوائیں جو اسی کا متروکہ تھا۔''

چنانچہ باغ تیس ہزاری واقع دہلی میں زیب النساء کا شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا۔مرزا سنگین بیگ نے اپنی کتاب سیر المنازل میں لکھا ہے:

''کابلی دروازہ کے باہر شارع عام پر تکیہ بھولو شاہ فقیر کے شمال کی جانب زیب النساء کا مقبرہ اور لال پتھر کی مسجد ہے۔اس عمارت پر خط ثلث میں یہ عبارت درج تھی۔

کل مر علیها فان

هذا امر قد البنت الکبریٰ العبد المذنب العاصی

المغفور بر حمته الرحیم الکریمه الحافظه زیب النساء

المرجومن عباد الله الصالحین ان یسعر العابالعفران و

الرضوان و تاریخ فوتها قوله، سبحانه'

"وادخلی جنتی"(1114ھ)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ خود اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی لڑکی کی تاریخ وفات نکالی اور یہ 1114ھ (1702ء) تھی۔ سر سید احمد خان نے آثار صنادید میں زیب النساء کے مزار کی باغ تیس ہزاری کی موجودگی کی تصدیق کی ہے۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد نے دیوان ذوق مرتب کرتے وقت لکھا ہے:

''شہر کے اندر کابلی دروازے کے پاس استاد مرحوم رہتے تھے، باہر ایک باغ بادشاہی تیس ہزاری باغ مشہور تھا۔ عمارات قدیم تعمیر تھیں۔ زیب النساء بیگم دختر عالمگیر کی قبر تھی۔ اس میں ایک بالا خانہ مرمت کر کے درست کرایا۔ شاہ صاحب وہیں جارہے تھے۔ شام کو استاد اور والد مرحوم وہاں جاتے تھے۔''

مسٹر بیل(Bell) نے لکھا ہے: ''زیب النساء کا مقبرہ بیرون کابلی دروازہ دہلی بے حد خوبصورت تھا۔ لیکن 1853ء میں حکومت نے اسے راجپوتانہ ریلوے لائن بناتے وقت منہدم کرادیا۔''

پنجاب نوٹس اینڈ کویرز ماہ اپریل 1885ء اس انہدام کا واقع درج ہے۔ نواں کوٹ لاہور میں واقع مقبرہ کو کسی صورت بھی زیب النساء کا مقبرہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ شہزادی کا مقام وفات بھی دہلی تھا اور اس طرح لاہور میں امانت کے طور پر دفن کرانے کے امکانات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ نواں کوٹ میں جو مقبرہ ہے، اس کی طرز تعمیر بھی قابل غور ہے۔ اس کی شکل صورت شاہ جہانی عہد کی عمارت سے ملتی ہے۔ سنگ مرمر اور سنگ ابری وغیرہ سے بنا ہوا فرش اور محرابوں کی قوس شاہ جہاں کی عمارت جیسے ہیں۔ مغل خاندان میں یہ دستور عام تھا کہ پردہ نشین خواتین کی قبر تہ خانہ میں بناتے تھے اور خالی تعویذ اوپر کے فرش پر ہوتا تھا۔ مقبرہ نور جہاں اور تاج محل میں یہ خصوصیت دیکھی جاسکتی ہیں لیکن زیر بحث مقبرہ میں نہ تہ خانہ ہے اور نہ اس پر تختی کا نشان ہے۔ چنانچہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ قبر کسی مرد کی ہے۔ مولانا عبداللہ قریشی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مقبرہ افضل خاں علامی کا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے کہتے ہیں کہ تاریخ کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ شاہ جہاں کے عہد میں چار جلیل القدر امیر لاہور میں فوت ہوئے۔ پہلا علی مردان خان، دوسرا آصف جاہ، تیسرا نصرت خان اور چوتھا افضل خاں علامی۔ افضل خاں 1048ھ میں فوت ہوا۔ بادشاہ اس وقت کابل گیا ہوا تھا، واپسی پر وہ لاہور میں افضل خاں کے رشتہ داروں کے پاس تعزیت کے لئے گیا۔ عین ممکن ہے کہ افضل خاں علامی کے محلات نواں کوٹ میں ہوں اور اسے وفات

کے بعد یہاں دفن کیا گیا ہو۔ اس بیان میں شک کی گنجائش ہے، کیوں کہ سکھ دور حکومت میں مسلمان امیروں کے بہت سے مزارات مسمار ہو گئے تھے اور اس طرح افضل خاں علامی کا مزار بھی ان میں شمار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نتیجے پر پہنچنا آسان نہیں کہ یہ مزار افضل خاں علامی کا ہے۔

سید محمد لطیف نے شاہجہاں نامہ کے مصنف سرغام الدولہ کے حوالے سے نواں کوٹ کے باغ جس میں یہ متنازعہ فیہ مقبرہ واقع ہے، بڑی تعریف کی ہے، انہوں نے لکھا ہے: ''اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء نے اس جگہ جہاں آج کل نواں کوٹ ہے ایک وسیع عریض باغ بنوایا اس باغ میں شہزادی نے خوبصورت عمارات اور گرمائی محل تعمیر کرائے۔ باغ کے عین وسط میں اس نے ایک مقبرہ بنوایا جس میں اسے وفات کے بعد دفن کر دیا گیا۔ یہ مقبرہ لاہور کی خوبصورت ترین عمارات میں سے ایک ہے۔ قیمتی خوبصورت پتھر جڑے ہوئے بنگلے، فوارے اور تالاب اس کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ فرش اور کھڑکیوں کی جالیاں سنگ مرمر کی تھیں لیکن رنجیت سنگھ نے حضوری باغ لاہور میں بارہ دری تعمیر کرنے کے لئے نواں کوٹ کے باغ کو ویران کر دیا اور اس کا قیمتی پتھر اکھڑوالیا۔ آج اس دلکش عمارت کا صرف ایک ڈھانچہ نظر آجاتا ہے۔ خوبصورت باغ اور عمارت منہدم ہو چکی ہیں۔ صرف مشرقی دروازہ عہد رفتہ کی یاد تازہ کرتا ہے۔''

تحقیقات چشتی میں زیب النساء کے مقبرے کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے زیب النساء کے حالات بھی دیئے ہیں لیکن وہ سراپا لغو معلوم ہوتے ہیں۔ عاقل خان اور زیب النساء کی داستان معاشقہ اور اورنگ زیب عالمگیر کا درمیان حائل ہونا بعید از عقل معلوم ہوتا ہے۔ زیب النساء جیسی باکمال شہزادی سے اس قسم کی کہانیاں منسوب کرنا جنہیں تاریخی طور پر کسی طرح ثابت نہیں کیا جاسکتا سراسر ظلم ہے۔ علاوہ ازیں مصنف نے واقعات اور تاریخیں دینے میں بھی غلطیاں کیں ہیں اور اس طرح قابل اعتبار نہیں۔ زیب النساء ایک مشہور شاعرہ ہے۔ ''مخفی'' اس کا تخلص تھا۔ ایک دیوان بھی ملتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اس سے منسوب کیے جاتے ہیں:

ای آبشار نوحہ گر از بہر کیستی
ایاچہ درد بود کہ چوں ماتمام شب
چیں بر جبیں فگندہ زاند وہ کیستی
مرا بسنگ می زدی و می گریستی

کہا جاتا ہے کہ یہ اشعار اس حساس اور نازک خیال شہزادی نے شالامار باغ کی بڑی بارہ دری میں واقع آبشار کو بہتے ہوئے دیکھ کر کہے تھے۔ وہ اکثر و بیشتر شام کے دھندلکے میں مرمریں تخت پر بیٹھی مشاہدہ قدرت میں مصروف رہتی تھی۔ یہ تخت آج بھی شالامار باغ میں موجود ہے۔

نواں کوٹ میں اس مقبرے کے علاوہ ایک کاشی کاری سے مزین دروازہ اور برج واقع ہیں۔ ان میں سے دروازے اور برج آبادی کے درمیان آ گئے ہیں۔ دروازہ درمیان میں ہے اور برج دونوں جانب کچھ فاصلہ چھوڑ کر واقع ہیں۔ دراصل یہ دروازہ باغ کی ڈیوڑھی تھی اور برج اس باغ کی چار دیواری کے دو گوشوں پر واقع تھے۔ دروازہ نہایت اعلیٰ گلکاری اور نقاشی سے سجایا گیا ہے۔ کسی کتبے کا پتہ نہیں چلتا۔ چاروں کونوں پر چھتری نما برج ہیں۔ تمام عمارت کو رنگ برنگی روغنی ٹائلوں سے مرصع کیا گیا تھا۔ باغ کے دونوں کونوں پر واقع برج بھی قابل دید ہیں۔ ان پر نہایت نازک اور نفیس کاشی کاری کی گئی ہے۔ ملتان روڈ پر واقع مقبرہ اب سادہ اینٹوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ یہ ایک مربع عمارت ہے۔ چوکور گنبد سے چھت ڈالی گئی ہے۔ عمارت کی چاروں اطراف میں محرابیں ہیں، درمیانی محرابیں بڑی ہیں۔ کچھ حصے پر فرش باقی بچا ہے جو نہایت خوبصورت ہے۔ درمیان میں قبر کا تعویز ہے جس سے صاحب مزار کا پتا نہیں چلتا۔ مقبرہ کوئی تین فٹ اونچے خشتی چبوترے پر واقع ہے۔ دائیں ہاتھ ایک کنواں اور گول کمرہ ہے جو آج کل چوکیدار کے قبضہ میں ہے۔ حال ہی میں (1970ء) مقبرے کی مرمت کرائی گئی ہے اور چونے کا پلستر کرا دیا گیا ہے جو شاید اس خستہ حال عمارت کو محفوظ کرنے کے لئے واحد حل خیال کیا گیا ہوگا۔ دروازے اور برجوں کی حالت نہایت ابتر ہے۔ نواں کوٹ کی ایک تنگ اور نہایت غلیظ گلی سے وہاں رسائی ممکن ہے۔ کاشی کاری کا کام مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب روز بہ روز ختم ہو رہا ہے۔ بچوں کے لیے یہ رنگین ٹکڑے اکھیڑنا روز کا معمول ہے۔ دروازے کی عمارت پر آگ جلانے سے سیاہی اور دھواں جم گیا ہے۔ کاشی کاری بھی صرف ان جگہوں پر باقی ہے جہاں ہاتھ پہنچ نہیں پاتا۔

سمن آباد مین روڈ سے ملتان روڈ آتے ہوئے نواں کوٹ کے اندر جانے کے لئے جو آخری گلی مڑتی ہے، یہ عمارت اسی گلی میں واقع ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس گلی کو پختہ کرا کے سڑک سے ملا دیا جائے۔ عمارت کے گرد دیوار کھڑی کی جائے اور عمارتوں کے ساتھ تختیاں نصب کی جائیں۔ مناسب مرمت اور دیکھ بھال کے بعد علاقہ سیاحوں کے لئے دلکشی کے باعث بن سکتا ہے۔ ہم اپنے ماضی اور اسلاف کی یادگاروں کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں تا کہ ایسی عمارات جو ہمارے فن تعمیر اور فن نقاشی کے ورثہ

میں ممتاز مقام رکھتی ہیں نئی نسل کے لئے رہنمائی کا کام دیں۔ ہم اپنے معدوم فنون کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ ان کا حصول اب ممکن نہیں رہا۔ کاشی کاری ایک ایسا ہی فن ہے جیسے تمام دنیا میں سراہا جاتا ہے اور آج اس کا بدل ممکن نہیں۔ ہم اپنا تاریخی ورثہ غیر ملکی مہمانوں اور سیاحوں کو دکھانا فخر سمجھتے ہیں، اس کے باوجود لاہور کی بیشتر تاریخی عمارات کسمپرسی کے عالم میں بتدریج ختم ہو رہی ہیں۔ آج ہم گزشتہ دور کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو اس عہد کو اچھا نہیں سمجھتے جب خوبصورت عمارات سے ساز و سامان لوٹ لیا گیا تھا اور انہیں مسمار کرا دیا گیا تھا۔ آنے والے دور میں ہمیں بھی اسی طرح یاد کیا جائے گا۔ لاہور کے زندہ دل باشندوں سے یہ توقع رکھنا بے جا نہیں کہ وہ جس عظیم ثقافتی ورثے کے امین ہیں اس کی پوری پوری حفاظت کریں گے۔ حکومت اور سرکاری دفاتر کے علاوہ یہ اہل محلہ اور اہل شہر کا بھی فرض ہے کہ وہ تاریخی نوادرات کی حفاظت اور ان تک جانے والے راستوں کی درستگی کے لئے مناسب اقدامات کریں۔

○

سوسال پہلے کا لاہور

''تحقیقات چشتی'' مولوی نور احمد چشتی کی ایک قابل قدر تصنیف ہے۔ یہ پہلی بار 1864ء میں طبع ہوئی۔ فہرست مندرجات پر ایک نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب تاریخ ہندوستان، احوال صوفیاء واولیائے کرام اور لاہور میں واقع مختلف تاریخی عمارات، مساجد، مقابر اور باغات کے تفصیلی بیان پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں کہیں کہیں آج سے ایک سوسال پرانے لاہور کے حالات بھی مل جاتے ہیں جو مصنف نے ضمناً بیان کر دیئے ہیں۔ ان سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ سکھ دور کے ختم ہونے اور انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں لاہور ایک بڑی تبدیلی سے گزرا ہے۔ پرانے آثار وصنادید کے ذکر میں مصنف نے خاصی تفصیل سے ان کی تاریخ اور مقام کو بیان کیا ہے۔ اگر چہ تاریخی وعلمی لحاظ سے یہ کتاب غلطیوں سے پاک نہیں اور بہت سے سنے سنائے افسانے حقیقت کے روپ میں پیش کیے گئے ہیں لیکن یہ تصنیف لاہور کی تاریخ پر پہلی کتاب تصور کی جائے گی۔ زمانہ حال کی تحقیق سے اس کتاب میں دیئے ہوئے بہت سے حالات اور واقعات غلط قرار دیئے جا چکے ہیں چنانچہ کوئی فیصلہ یا نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے ان امور کو مدنظر رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

مولوی نور احمد چشتی کے آباؤ اجداد ہمایوں کے ساتھ ایران سے برصغیر پاک وہند میں آئے تھے۔ وہ 1828ء میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ مدرسی کی اور پھر انگریز افسروں کو اردو پڑھانے پر مامور ہوئے۔ مسٹر ولیم کولڈ کریم اسسٹنٹ کمشنر لاہور کی فرمائش پر انہوں نے ''تحقیقات چشتی'' قلمبند کی۔ اس کتاب کے موضوع کے متعلق وہ لکھتے ہیں، ''اور واضح رائے مہر ابخلائے۔ شائقین باتمکین ہو کہ ظاہر تو یہ کتاب اگر چہ مشعر احوال مقابر بزرگان اہل اسلام وغیرہ عمارات وتشریح معابد ومراسم قدیمہ ہنودان لاہور ہے لیکن فی الاصل تواریخ اولیاء اللہ تمام روئے زمین ہے اور حتی الامکان اس میں ہر خانوادہ کا احوال کماحقہ خندہ التحقیقات کتابی وسماعی جو زبانی اشخاص خاص سے دریافت ہوا درج کیا گیا ہے اور نیز تحریر کیا

گیا ہے کہ فلاں صاحب اہل مقبرہ کب اور کس زمانہ میں اور کہاں تولد (ہوئے) اور باعث شہرت اس کا کیا (ہے) اور آخر کب فوت ہوا اور کیا تاریخ اس (کے) فوت ہونے کی تھی اور کون کون اس کا خلیفہ و مرید و معتقد ہوا اور شجرہ حسبی و نسبی اس کا کیا ہے اور اس کا شجرہ کے اشخاص میں کون کون صاحب نامور ہوا اور اب تک کے بعد اس کے کس قدر سجادہ نشین ہوئے اور اب کون موجود ہے اور صاحب قوم سے کون تھا اب اس کی اولاد ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس قدر اور کس مقام پر ہے اور مقبرہ اب رجسٹر نزول سرکار میں درج ہے یا نہیں اور اس مکان، مقبرہ شیودوالہ یا گوردوارہ یا ٹھاکر دوارہ وغیرہ کے ساتھ کیا معافی ہے۔ زمین ہے یا گاؤں یا نقدی اور باعث تقرر اس معافی یا جاگیر یا پنشن کا کیا ہوا اور مقدار و تعداد زر معافی کیا ہے اور بوقت سلطنت چغتائی و سکھاں کس قدر تھی اور اب کس قدر ہے اور یہ معافی کس کے حکم اور کس وجہ سے اول مقرر ہوئی اور وہ معافی یا جاگیر یا پنشن حین حیات سجادہ نشین یا تا قیام خانقاہ معاف تھی یا علی الدوام نسلاً بعد نسل سجادہ نشین کو عطا ہے اور کس قدر خرچ سالیانہ اور آمدنی اس مکان، اس مکان، خانقاہ یا شوالہ وغیرہ کی ہے اور اس آمدنی میں کس قدر شریک ہیں اور کتنے حصوں پر تقسیم ہوتی ہے اور خرچ میں کتنی پتیاں ہیں اور عرس یعنی سالیانہ کب ہوتا ہے اور عرس کرنے کا دستور کیا ہے اور عرس پر کیا کیا کھانا تقسیم ہوتا ہے اور اس عرس پر ہجوم عام ہوتا ہے یا چند اشخاص خاص حاضر ہوتے ہیں اور صاحب قبر کا سلسلہ کیا ہے اور پیوند اس کا کس اہل طریق سے ہے اور کون کون لوگوں کی وہاں قبریں ہوتی ہیں اور کب سے وہ قبرستان ہے عمارت اس مقبرہ یا مکان کی کس نے بنوائی اور کس سال میں بنی اور پہلے کس قدر عمارت تعمیر ہوئی اور اب کس قدر ہے یعنی پہلی عمارت سے وہ عمارت زیادہ ہوئی یا اس میں سے مسمار ہو کر کم ہوگئی اور تفصیل مغل عمارت کہ بالفعل فی زمانہ اس قدر موجود ہے۔ اس میں اس قدر چار دیواریاں اور اتنی کوٹھریاں اور اتنے دالان اور اتنے احاطہ قبور مع طول و عرض و ارتفاع اس عمارت موجودہ کے اور نیز تشریح مشروع عمارت کی گلی سنگین یا خشتی ہے اور مفصل حال اس کے سلسلہ اور فقر کا اور بعینہ نقل اس تحریر کی جو اس عمارت پر تحریر ہے۔"

اس طویل تعارف موضوع کتاب کے بعد مولوی نور احمد چشتی نے اپنے اور اپنے خاندان کے متعلق لکھا ہے۔ تالیف کی تاریخ اور مسلک و سلوک کے بیانات کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے سب سے پہلے ہندوستان کے ابتدائی دور کی تاریخ ہے جسے انہوں نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے ہندو عہد، گوتم بدھ، سکندر کا حملہ اور بکرماجیت وغیرہ۔ اس کے بعد تذکرہ شاہان اہل اسلام ہے پھر ذکر سلطنت مغلیہ ہے اور آخر میں سکھوں کے عہد کی تاریخ ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ احوال صوفیاء و بزرگان پر مشتمل ہے۔ اس

میں لاہور اور بیرون لاہور واقع مقابر اور صاحبان مقابر کے حالات ہیں۔ کتاب کا تیسرا حصہ لاہور کے تکیوں اور مختلف قبور کے بارے میں ہے۔ چوتھے حصے میں مڑھیوں اور غیر مسلم فقیروں کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ پانچویں حصے میں مساجد اور مختلف عمارات کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ ساتویں حصے میں مقابر صوفیاء و بزرگان کے بارے میں لکھا گیا ہے اور آٹھویں حصے میں مقابر سلاطین اور رؤساء کا بیان ہے۔

تحقیقات چشتی کا بڑا حصہ تصوف اور مسلک وسلوک کے بیان پر مشتمل ہے۔ احوال صوفیائے کرام بھی نہایت عقیدت واحترام سے دیا گیا ہے۔ جہاں جہاں موقع ملا ہے یہ ذکر کتاب میں تفصیل سے درج کیے گئے ہیں۔ بہر حال لاہور شہر اور اس کے نواح میں ہونے والے سیاسی وسماجی واقعات سے بھی پردہ پوشی نہیں کی گئی اور اس وجہ سے یہ کتاب ایک صدی پہلے کے لاہور کو سمجھنے کے لئے خاصی کارآمد ہے۔ مولوی نور احمد چشتی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں پیدا ہوئے۔ سکھوں کی خانہ جنگی ان کے مشاہدے میں آئی۔ پھر 1849ء میں یعنی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے دس سال بعد جب انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کیا تو یہ یہیں موجود تھے۔ اس طرح انہیں ایک دَور سے دوسرے دَور میں منتقل ہوتے لاہور کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ سکھوں کی لڑائیوں کا حال انہوں نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ اس زمانے میں لاہور کی باقیات پر جو کچھ انہوں نے لکھا وہ آج بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے اور معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کون کون سی عمارات اس وقت موجود تھیں۔ لاہور کے مضافات اور محلوں وغیرہ کی تفصیل بھی درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور بتدریج جنوب مغرب کی جانب وسیع ہو رہا تھا۔ احوال صوفیائے کرام میں انہوں نے اس دور کی مذہبی اور ثقافتی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ مسلموں اور غیر مسلموں کے میلوں اور رسومات کے متعلق بھی پتا چلتا ہے۔ الغرض تحقیقات چشتی موجودہ زمانے میں لاہور کے پرانے مزاج کو سمجھنے کے لئے ایک عمدہ ذریعہ بن گئی ہے۔

مولوی نور احمد چشتی، مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد افراتفری کے دور کو یوں بیان کرتے ہیں: ''جب مہاراجہ رنجیت سنگھ اس جہان فانی سے راہ گرائے عالم جاودانی ہوئے تو مہاراجہ کھڑک سنگھ خلف الصدق ان کی کرسی حکومت پنجاب پر بیٹھے۔ اس زمانے میں سلطنت کا جھگڑا شروع ہونے لگا، چنانچہ ایک شخص مسمی چیت سنگھ جو ہم راز و ہمدم مہاراجہ کھڑک سنگھ کا تھا، مدعی عہدہ وزارت ہو کر درصدمہ اخراج راجہ دھیان سنگھ وغیرہ متوسلان اس کی ہے کے ہوا۔ ازاں بعد وہ امور سلطنت میں بھی دخیل تھا۔ بمضمون آں کہ بیت:

میاں جی چناں کن براہ ثواب
کہ ہم سیخ بر جابود ہم کباب

کنورنونہال سنگھ کوخود پسند مغرور وہونہار دیکھ کراس پر لایا کہ وہ چیت سنگھ کوقتل کرڈالے اور خود مختار بلاشرکت غیرے دسادہ آرائے حکومت ہو اور مہاراجہ کھڑک سنگھ جو بھولے بھولے مرنجان مرنج شہد مزاج ہیں، خلوت گزین ہوکر مشغول عبادت الٰہی رہیں۔ القصہ کنور مذکورہ نے ایک رات چیت سنگھ حمایت راجہ دھیان سنگھ وغیرہ سرداران کو مارڈالا۔''

راجہ دھیان سنگھ، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر تھے۔ ان کی بنائی ہوئی حویلی شہر کے اندر قلعہ کے نزدیک بازار سید مٹھا میں واقع ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی ابتدا اسی حویلی سے ہوئی۔ پاکستان بننے سے پہلے یہاں دیال سنگھ ہائی سکول اور آج کل (1970ء) سٹی مسلم لیگ ہائی سکول ہے۔ ایک پختہ ڈیوڑھی اور دروازے کے بعد صحن آتا ہے، جس میں دھیان سنگھ کی سمادھ ابھی تک موجود ہے۔ نوراحمد چشتی مزید لکھتے ہیں: ''اس سے مہاراجہ کھڑک سنگھ کو صدمہ عظیم غم ہجر کا پہنچا۔ پھر وہ کنورنونہال سنگھ و راجہ دھیان سنگھ سے بجان ناراض ہوکر تارک عن الدالامور السلطنت کنارہ ہو بیٹھے اور شب و روز یہی دعا بحق ان ظالموں کے کرتے تھے کہ خدا ان کو آرام دنیا میں نہ رکھے۔ ایک روز کنورنونہال سنگھ سلام کے واسطے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے ان کو دیکھتے ہی ایک آہ جگر سے مار کر کہا اے کنور تو چوڑ ہے۔ (چوڑ پنجابی زبان میں بربادی کو کہتے ہیں)۔ ظاہر تو پدر آزاری کر کے خیال کرتا ہے کہ میں راج کروں گا مگر خاطر جمع رکھوں گا۔ خدا تم کو میرے پیچھے نہ رکھے اور سلطنت بھی خراب ہو جائے گی اس وقت تو میرا دل یہ چاہتا ہے کہ انگریزوں کو بلا کر تمام ملک پنجاب ان کے حوالہ کردوں مگر بدنامی سے ڈرتا ہوں کہ تمام ملکوں میں مشہور ہوگا کہ اس محنت کی سلطنت مہاراجہ کلاں کی بنائی ہوئی اس کے ناخلف ولی عہد نے مفت خراب کردی مگر یہ یادرکھنا کہ اس امر قبیح اور خون ناحق کے عوض سلطنت اس خاندان سے چلی جائے گی۔'' آگے چل کر لکھتے ہیں: ''راجہ دھیان سنگھ کو یہ خیال تھا کہ مہاراجہ شیر سنگھ میرا دوست نشاندہ ہے۔ یہ ہمیشہ میرا مطیع رہے گا اور اپنی شجاعت پر مغرور ہوکر محکوم نہ رہنا چاہتا تھا۔ اس باعث سے وہم بین ان کی شکر رنجی سے پیدا ہوا۔ بعد چندے مہاراجہ شیر سنگھ نے سرداران سندھانوالیہ کو طلب کرلیا عہدہ ہائے جلیلہ پر سرفراز کیا مگر اس سے بے خبر کہ:

چوں کر دی باکلوخ انداز پیکار
قدر کن کا ندر آما جش نشینی

ان کو دوست تصور کر کے ہمراز اپنا بنالیا۔ اس کے مدعائے دل تھا کہ راجہ دھیان سنگھ کا قدم امور سلطنت سے نکال دے اور وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کو معزول کر کے دلیپ سنگھ کو اس کا قائم مقام بنادے۔ سرداران سندھانوالیہ دونوں طرف اصلاح کار و ہمراز تھے۔ آخرش 1845ء سردار چیت سنگھ سندھانوالیہ نے بروز پنج اسوج صبح بمقام شاہ بلاول صاحب مہاراجہ شیر سنگھ کو مع کنور پرتاب سنگھ خلف الصدق اس کو جو بعمر چودہ سال تھا نہ تیغ بے دریغ کر ڈالا۔"

اس خونچکان داستان کے بعد مولوی نور احمد چشتی نے اس دور کی سیاسی مصلحتیں اور چالیں بیان کی ہیں۔ اس کہانی کا اختتام یوں ہوا کہ رانی جنداں نے خودسر اور طاقت ور خالصہ فوج کا زور توڑنے کے لئے انگریزی علاقے پر حملہ کر دیا اور اس طرح رنجیت سنگھ کی بنائی ہوئی حکومت اور فرانسیسی جنرلوں کی تربیت یافتہ مضبوط سکھ فوج ملیامیٹ ہوگئی۔ 29 مارچ 1849ء کو تمام پنجاب حکومتِ انگریزی میں داخل ہو گیا اور 4 چار لاکھ روپیہ سے زیادہ سالانہ پنشن مہاراجہ دلیپ سنگھ کی مقرر ہوئی۔ یہ وہ اقتباسات تھے جن سے اس دور کی سیاسی زندگی کا پتا چلتا ہے۔ تحقیقات چشتی کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس میں شہر لاہور کی عوامی زندگی کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں۔

صوفیاء کے تذکروں میں کہیں کہیں مذہبی اعتقادات اور نظریات بھی ملتے ہیں۔ لاہور کے میلوں اور کھیل تماشوں کا ذکر بھی موجود ہے۔

میلہ چراغاں

میلہ چراغاں کے متعلق لکھتے ہیں:

"اور ان ایام میں بھی باوجودیکہ خلق بے کاری سے نالاں ہے امرتسر سے بسواری ریل، ساٹھ ستر ہزار آدمی تخمیناً شریک جلسہ چراغاں ہوتا ہے اور سواران یکہ و پیدل و بگھی و اونٹ ریل سے علیحدہ آتے جاتے ہیں اور خرید و فروخت اشیائے حلوائیاں کا کیا خیال کیا جائے اس روز تمام حکام ضلع و افسران پولیس وہاں بندوبست کے واسطے رونق افروز رہتے ہیں اور اس روز ایک دکان آبکاری کی بھی وہاں پر قائم ہوتی

ہے۔ خیال کرنا چاہیے کہ شرفا ایسے میلوں پر ادھر میل کم کرتے ہیں اس روز جہاں تک کہ نظر جاتی ہے۔ ملبوسات فاخرہ ہر شخص کے زیب تن ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ جو شخص رات کے کھانے کا بھی محتاج ہوتا ہے وہ بھی اس روز نواب وضع بن کر نکلتا ہے۔''

بسنت

''آمدم برسر مطلب کہ بروز بسنت بعہد علمداری سکھاں مہاراجہ صاحب بہادر کا یہ معمول تھا کہ تمام امیر ورئیس وفوج کو حکم ہوجاتا تھا کہ وردی ولباس بسنتی پہنیں اور زین وہودج ومیانہائے اسلحہ وغیرہ تمام بسنتی ہوا کرتے اور ہر شخص معنی فاقع اہلونہا تسر الفاظاہرین سے لذت گیر ہوا کرتا تھا۔ رنگریزان شہر اس روز میں برس بھر کی روٹیاں کما لیتے تھے یعنی تیاری ایک رنگ میں ایک دمڑی کی ہلدی خرچ کر کے کم از کم چار آنہ فی دستار نرخ کر دیا کرتے تھے۔ جب اس طرح فوج جم جاتی تو بوقت دو بجے سواری مہاراجہ کی قلعہ سے نکلتی اور تمام مخلوقات جو منتظر دیدار سرکار ہوتے تھے۔ جب آواز توپہائے شلک سلامی سنتے تو ہشاش بشاش ہو کر خندہ زن ہوتے۔ جب مہاراجہ کی سواری میلہ میں آتی تو یہ لطف ہوتا کہ اب اس کی یاد میں چشم آب ہوتی ہے۔ کم از کم ساٹھ ستر ہاتھی اور چار پانچ سو گھوڑا بازین ہائے مرصع وتمام ڈیڑھ سو سواران چار پائی اور دو ز جمنٹ پیدل اردل جلو میں ہوا کرتی تھیں اور شاہ سے گدا تک ہر ایک شخص بسنتی پوش ہوا کرتا تھا بلکہ در و دیوار بھی بسنتی نظر پڑتے تھے اور مہاراجہ مٹھیاں روپیوں کی بھر بھر تصدق کرتے اور پھینکتے ہوئے تا مزار پر انوار حضرت حسین کے پہنچتے اور بعد سواری سے اتر پاپیادہ ہو باارادت تمام مع روسائے عالی مقام پابرہنہ خانقاہ کے دروازے سے اندر جاتے ہیں پھر شلک سلامی کی ہوتی۔ پھر گیارہ سو روپیہ نقد مع دوشالہ بسنتی خانقاہ پر نظر چڑھا کر جبیں سائی کے بعد رونق افزائے خیمہ شاہی ہوتے تھے۔ وہاں عرش سے فرش تک تمام بسنتی بسنتی اشیاء موجود حاضر ہوتی تھیں پھر حسب معمول خود یعنی ایک بروز سہر اور دوسرے بروز بسنت تمام ملازمین سے نذر علی قدر مراتب لے کر باخلقت ہائے فاخرہ پر ایک سرفرازی بخشتے تھے اور پھر عطر، عنبر وگلال بطور شروع جشن ہولی اڑتا تھا۔ پھر لالہ رخان حوروش یعنی تمام طوائفان لاہور وامرتسر جو حسب الحکم اس روز وہاں حاضر ہوا کرتی تھیں مجرائے شاہانہ ادا کر کے نوبت نبوت بتقریب تفریح طبع سرکار ناچ میں مشغول ہو کر باانعامات گراں سرفراز ہوا کرتی تھیں اور نذر کا روپیہ واشرفی اس روز مہاراج کی خدمت میں جمع ہوتا تھا، وہ بتقریب انعام یوم بسنت خدمت گاراں کو تقسیم ہوجاتا تھا۔''

ایک اور دلچسپ واقع بیان کیا ہے: ''خاکروبوں کے عقائد لایعقل ہیں۔ان کو یہ یقین کہ بروز قیامت والیان بہشت صرف مہتر لوگ ہوں گے اور بلا اجازت ان کے کوئی داخل بہشت نہ ہوگا جب میں نے سوال کیا کہ ہم لوگ وغیرہ اقوام کا کیا حال ہے تو فرمانے لگے کہ اگرچہ کوئی صورت ادخال بہشت کی کسی قسم کے واسطے نظر نہیں آتی لیکن ہاں ہم لوگ جو سب گھروں میں جاتے ہیں۔اگرچہ اس لحاظ سے جناب الٰہی مہربانی کر کے ان لوگوں کو بھی اجازت ادخال بہشت عطا کرے تو مضائقہ نہیں کیوں کہ ہم لوگوں کے پیروں کی خاک بھی بہشت میں جائے گی۔میں نے یہ سن کر عرض کیا کہ بے شک آپ درست فرماتے ہیں۔فقط''

پنجاب پبلک لائبریری

پنجاب پبلک لائبریری کے متعلق لکھا ہے: ''سبحان اللہ!'' سرکار عالی وقار نے کیا کیا اچھے دستور مقرر کیے ہوئے ہیں کہ ہر مقام نامی میں کہ جہاں صاحب لوگ رہتے ہیں ایک کتاب گھر مقرر کیا جاتا ہے (اصل میں یہ رسم مقررہ و مروجہ شاہان سلف ہے) دیکھنا چاہیے کہ اس میں کیا کیا فائدے نزدی ہیں۔اس میں ہر طرح کی کتابیں قدیم و جدید موجود رہتی ہیں اور ہر مقام سے کاغذات اخبار یہاں آتے ہیں اور جو جو کتب مطابع انگلینڈ ہند میں ماہوار مطبوع ہوتی ہے وہ برابر اس میں آتی ہیں۔دیکھنا چاہیے کہ اس تقرر کتاب گھر سے کتنا فائدہ ہوتا ہے اگر کوئی شخص کتاب خریدے اور یہ اخبار منگوائے تو کیا کچھ خرچ ہوتا ہے۔یہاں کا معمول ہے کہ صاحبان شائقین سے جو چاہے اس جلسہ کا شریک ہو جاوے یہاں کا معمول ہے کہ خرچ ماہوار کتاب گھر ایک دو روپیہ ماہواری ہر ایک شائق کو دینا پڑتا ہے۔جو کوئی وہ روپیہ دے تو کل اخبار کتب کا ملاحظہ کرے۔ایک صاحب اس جلسہ کا میر مجلس ہوتا ہے اور خاص اس مقام کے واسطے ایک دو چپڑاسی مع ایک دفتری و خانسامہ مقرر ہوئے ہیں۔وہ کتب جدید ہر شائق کو پہنچا دیتے ہیں اور یہ مکان ہر طرح کے فرش و فروش چوکی میز سے آراستہ رہتا ہے۔اس میں ایک تو ایسے کتب اور کاغذات ہوتے ہیں کہ نوبت نبوت چپڑاسی صاحبوں کی خدمت میں پہنچا دیتا ہے اور بعضے ایسے ہیں کہ ان کا دیکھنا خاص اسی مکان میں مقرر ہے جو صاحب یہاں دیکھنے آتا ہے۔اس کو ہر طرح فراغت رہتی ہے۔اکثر صبح و شام اجتماع شائقین ہوتا ہے جو کوئی یہاں چائے پانی پیئے تنخواہ زیادہ دے الغرض کسی وجہ سے تکلیف نہیں ہوتی۔علاوہ بر آں ''چہ خوش بود کے برآمد بیک کرشمہ دو کار''، ایک تو سیر اخبار دیار و اہار و تحصیل بے فوائد

شمار ہوتی ہے اور ماسوائے اس کے چند دوستاں ہم وطن مل بیٹھتے ہیں۔افسوس کے ابنائے جنس ما مردمیں فی زمانہ یہ مراسم مروج نہیں کیا اچھا ہو کہ روسائے ہندوستان میں بھی یہ سلسلہ جاری ہو جائے۔“

مولوی نور احمد چشتی نے اپنے زمانے کے لاہور کو اسی طرح کے کتنے ہی مضامین میں ظاہر کیا ہے۔اس سے پتا چلتا ہے کہ لاہور اس وقت ایک بڑے خلفشار اور تبدیلی کے دور میں تھا۔لاہور کے باحول میں بہت سی نئی چیزیں داخل ہو رہی تھیں۔سکھوں کے آخری دور میں لاہور پر خوف و بربریت کا غلبہ رہا۔امن و امان قائم ہوتے ہی شہر میں جدید طرز زندگی اور خیالات کو اپنانے کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ انگریزی حکومت کے تحت نئے تعلیمی ادارے مثلاً گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی کالج وغیرہ قائم کیے گئے تو لاہور کے باشندوں کی جانب سے ان کا خیر مقدم کیا گیا۔لاہور کے نواحی علاقے مثلاً مزنگ،نواں کوٹ، باغبانپورہ اور اچھرہ اس زمانے میں علیحدہ قصبات تھے اور شہر سے ان قصبات کو جانے کے لئے بے آباد راستوں سے گزرنا ہوتا تھا جو اکثر خطرناک ثابت ہوتا تھا۔ چنانچہ رات کو ادھر سے گزر تقریباً ناممکن ہو جاتا تھا۔سکھوں کی خانہ جنگی کے واقعات بیان کرتے وقت مصنف نے جو لہجہ اختیار کیا ہے،اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ باشندگان لاہور کی حالت اس زمانے میں ایسی تھی جیسے ان چھوٹے بچوں کی جو گھر میں ماں باپ کی لڑائی کے وقت سہم جاتے ہیں۔لاہور کے گلی کوچوں میں سکھوں کے دو گروہوں کی جنگ جاری تھی۔ بادشاہی مسجد کے میناروں سے قلعہ شاہی پر گولے برس رہے تھے اور شہر کی موریوں میں عالی مرتبت امراء و روسا کے سر ٹھوکریں کھا رہے تھے۔اس وقت لاہور کی بدنصیب آبادی کس حالت میں ہوگی اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔اسی لیے جب انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کیا اور امن و امان بحال کیا تو انہیں کسی عوامی مزاحمت کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا۔

لاہور کی وسعت

لاہور کے میلے اور عرس تحقیقات چشتی کا خاص موضوع ہیں۔ چنانچہ میلہ چراغاں،عرس داتا گنج بخش اور عرس شاہ ابوالمعالی کا خصوصیت سے ذکر ہے۔ان سے اس زمانے کی ثقافتی زندگی کا پتا چلتا ہے۔دور انحطاط کی نشانیاں پوری طرح عیاں ہیں لیکن دور جدید کا پرتو بھی کہیں کہیں نظر آ جاتا ہے۔سماجی برائیاں اور نامناسب حرکات کا بھی ذکر ہے۔لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خلاف شرفا کا ایک طبقہ مسلسل جہد آزما ہے۔لاہور شہر کی تقسیم کچھ اس طرح سمجھ میں آتی ہے:

1-لاہور کا قدیم علاقہ:

اس میں شہر کے مقامی باشندے رہتے تھے اور یہ کم وبیش فصیل کے اندر واقع علاقے پر مشتمل تھا۔ اس میں بڑی بڑی حویلیاں مساجد اور مزارات ہیں۔

2-لاہور کا انگریزی علاقہ:

اس میں وہ علاقے شامل تھے جہاں کی انگریزوں کی آبادی تھی۔ قلعہ لاہور، انارکلی، باغ قاسم خان (موجودہ گورنمنٹ ہاؤس وغیرہ) اور سول لائنز کا علاقہ انگریزوں کے زیر استعمال تھا۔ میاں میر چھاؤنی تعمیر ہونے سے پہلے فوج کے افسر یہیں رہتے تھے۔

3-لاہور کے نواحی قصبے:

ان میں باغبانپورہ، بیگم پورہ، گڑھی شاہو، چاہ میراں، قلعہ گجر سنگھ، نواں کوٹ، نور کوٹ، سرائے گولا والا، مزنگ، اچھرہ اور میاں میر وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں اکثر کے گرد دیوار تھی اور شہر لاہور سے سڑک کے ذریعے ملے ہوئے تھے۔ ان قصبوں اور لاہور کے درمیان آبادی ہونے میں سو سال کا عرصہ لگا ہے۔ چشتی لاہور کے اس پرانے ماحول کے آخری راوی ہیں جو مغلوں کے عہد میں تشکیل پذیر ہوا اور اس کتاب کی تصنیف 1864ء تک کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا۔ آج بھی ہم اپنے اردگرد اس ماحول کی باقیات کو محسوس کر سکتے ہیں۔ یہی لاہور کا مزاج بن چکا ہے جو اس شہر کے آباد ہونے سے اب تک قائم ہے اور اسی ماحول کی رنگینی کو ہم لاہور کہتے ہیں۔

○

جنتِ لاہور۔ باغِ جناح

فن تعمیر کو آج کل ماحول تخلیق کرنے کا فن کہا جا رہا ہے۔ نوجوان ماہرین فن تعمیر جو مستقبل میں پاکستان کے لیے نئے ماحول اور نئے شہر ترتیب دیں گے، عمارات کے علاوہ اس علاقے اور گردوپیش کے ماحول کو بھی اہمیت دیتے ہیں جہاں یہ عمارت بنائی جائے گی۔ عمارات کے لئے مناسب ماحول تیار کرنا بھی انہیں کے دائرہ کار میں شامل ہے۔

ماضی میں یہ پہلو نظر انداز کر دیا جاتا تھا لیکن اب شہروں محلوں اور عمارتوں کے ماحول کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں لاہور کا ماحول اس کی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ پوری طرح سمجھنا ان ہنرمندوں کے لیے لازمی ہے جو مستقبل میں یہاں عمارات وغیرہ کی ترتیب وتخطیط کے ذمہ دار ہوں گے۔ لاہور کی شہری زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہاں کے باغات اور تفریح گاہوں کا مشاہدہ بہت ضروری ہے۔ باغ جناح لاہور کا سب سے اہم اور وسیع باغ ہے۔ (1970ء) لاہور کے شہریوں کے لئے اس کی جو اہمیت ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ مستقبل میں آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ کھلی جگہوں اور پارکوں کی کمی شدت سے محسوس کی جائے گی۔ اس وقت باغ جناح لاہور کی جنت بن کر یہاں کے باشندوں کو تفریح اور سکون کے مواقع فراہم کرے گا۔ باغ جناح کو لاہور کے شہریوں کے لیے مزید کار آمد اور پرکشش بنانے کے لیے شہری حکام، محکمہ زراعت اور ماہرین فن تعمیر کی مشترکہ کوششوں سے بہت کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

باغ جناح جسے پہلے لارنس گارڈن کہتے تھے شارع قائداعظم (مال روڈ) لارنس روڈ، شارع فاطمہ جناح (کوئنز روڈ) اور ریس کورس روڈ کے درمیان واقع ہے۔ اسے ایشیا کے مشہور خوبصورت ترین باغات میں شمار کیا جاتا ہے۔ 1860ء سے پہلے یہ جگہ ویران تھی اور کہیں کہیں کاشتکاری ہوتی تھی۔ گورنمنٹ ہاؤس بننے سے پہلے اس کے نزدیک مقبرہ قاسم خاں واقع تھا جسے گنبد کشتیاں والا کہا جاتا تھا۔ مہاراجہ

رنجیت سنگھ کے عہد میں یہاں اکھاڑہ بنا ہوا تھا اور پہلوان کشتیاں لڑا کرتے تھے۔ مزنگ کے مشرقی جانب مٹی کے برتن پکانے والے آوے تھے۔ 1861ء میں جب لارنس ہال تعمیر ہوا تو آس پاس کی زمین میں باغ لگایا گیا۔ بعد میں اسی باغ کو وسعت دے کر ایگریکلچر ہارٹی کلچر سوسائٹی آف انڈیا کے سپرد کر دیا گیا۔ سوسائٹی کا خرچ چلانے کے لیے لاہور کے شہری چندہ دیتے تھے اور باغ میں پیدا ہونے والی فصلیں سبزیاں اور پھل فروخت کیے جاتے تھے۔ 1868ء میں سوسائٹی کو بادامی باغ لاہور منتقل کر دیا گیا اور اس رقم سے سوسائٹی کے باغ کے لئے مزید زمین خریدی گئی۔ اس زمانے میں شہر سے تین میل یعنی گورنمنٹ ہاؤس تک کا علاقہ سر ڈانلڈ میکلوڈ کے نام پر ڈانلڈ ٹاؤن کہلاتا تھا۔ یہ علاقہ انگریزوں کی آبادی تھی۔ چنانچہ 1876ء میں محکمہ زراعت کے تحت یہاں پر بوٹانیکل گارڈن (نباتاتی باغ) قائم کیا گیا جہاں سے شہریوں کو پودے بیج اور قلمیں مہیا کی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں یہاں ایک زراعتی تربیتی سکول کھولا گیا۔ بعد میں اسے لائل پور (اب فیصل آباد) منتقل کر دیا گیا اور زراعتی کالج (اب یونیورسٹی) کا درجہ دیا گیا۔ 1892ء میں یہ باغ تین حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ بوٹانیکل گارڈن تھا جو محکمہ زراعت کے سپرد تھا، دوسرے میں چڑیا گھر قائم تھا اور تیسرے کو عوامی تفریح گاہ کی حیثیت دی گئی تھی۔ یہ حصہ میونسپل کمیٹی کے سپرد تھا۔ 1910ء میں اس باغ کو از سر نو ترتیب دینے کا منصوبہ بنایا گیا، چنانچہ اسے مغربی طرز کے باغ میں تبدیل کرنے کے لیے انگریز ماہرین بلائے گئے۔ سہارن پور سے دو ماہر فن مالی لائے گئے۔ انہوں نے مقامی مالیوں کو تربیت دی۔ پہلے یہ باغ پھلدار درختوں کا ذخیرہ تھا جس میں آڑو، آلوچہ، لوکاٹ وغیرہ کے درخت تھے۔ ایک حصہ میں محکمہ زراعت کا تجرباتی فارم اور اسکول تھا۔ 1910-12ء کے دوران باغ میں عمارات اور روشیں بنائی گئیں۔ وسیع و عریض پلاٹ صاف کیے گئے۔ پھلدار درختوں کی جگہ خوبصورت اور آرائشی درخت لگائے گئے۔ مٹی کے برتن پکانے کے آوے ٹھیک ٹھاک کر کے پہاڑیوں کی شکل میں رہنے دیئے گئے اور ان پر ولائتی کیکر اور انواع و اقسام کی جھاڑیاں اور پھولدار پودے لگائے گئے۔ ان پہاڑیوں میں سے ایک سکندر پہاڑی کہلاتی ہے۔ دوسری کا نام فضل پہاڑی ہے۔

لارنس روڈ پر دو مزید پہاڑیاں بھی ہیں جن میں سے ایک نسبتاً غیر آباد رہتی ہے اور دوسری پر اوپن ائیر تھیٹر قائم ہے۔ پہلے اس تمام علاقے کی سیرابی کے لیے چار کنویں موجود تھے۔ پھر نہر اپر باری دوآب لاہور برانچ سے پانی لیا گیا۔ پہاڑیوں پر پانی پہنچانا ایک مسئلہ تھا۔ چنانچہ فضلی پہاڑی پر ایک ٹیوب ویل اور واٹر ٹینک بنایا گیا۔ یہ تمام ترتیب و آرائش مسٹر آسٹو سپرنٹنڈنٹ کے زمانے میں ہوئی۔

مسٹر ای ایچ ہیوج نے بھی قابل قدر اضافے کرائے۔ باغ کی سب سے معمر مالی چوہدری غلام نبی (1970ء) کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کی زندگی میں یہ باغ دیکھتے ہی دیکھتے موجودہ شکل اختیار کر گیا ہے۔ پہلے پہل تو لوگ ویرانی کی وجہ سے یہاں آتے ہوئے ڈرتے تھے۔ رفتہ رفتہ رونق ہونا شروع ہوگئی۔ خصوصاً شام کو لوگ کلبوں میں کھیل کود اور تفریح کے لئے آتے تھے اور باغ میں چہل قدمی کرتے تھے۔ کرسمس کے دنوں میں انگریز دور دور سے چھٹیاں منانے آتے اور باغ کی رونق بڑھ جاتی۔ اس پلاٹ کو جسے آج کل گلستان فاطمہ کہتے ہیں، بوڑھے غلام نبی کی آنکھوں نے تعمیر ہوتے دیکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس جگہ پہلے ایک جوہڑ تھا جس میں چڑیا گھر کا پانی اک نالی کے ذریعے ڈالا جاتا تھا۔ مسٹر ہیوج کے یہاں لندن سے ایک آرکیٹکٹ مہمان آیا۔ اس نے ایک دن بیٹھے بیٹھے اس پلاٹ کا ڈیزائن بنایا اور مسٹر ہیوج نے اسے حقیقت کا روپ دیا۔ لارنس ہال کے سامنے جو گول میدان ہے وہ بینڈ سٹینڈ کہلاتا ہے۔ ہر روز شام کو پنجاب پولیس یعنی پنجاب کنسٹبلری کا بینڈ یہاں مظاہرہ کرتا تھا۔ انگریز بچوں کی آیائیں بڑی تعداد میں جمع ہوتیں تھیں اور بچوں کو خوش کرنے کے لئے بینڈ کی دھنیں بجائی جاتی تھیں۔ اس باغ کا نام لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سر جان لارنس کے نام پر لارنس گارڈن رکھا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد بانی پاکستان کے نام پر اسے باغ جناح کا نام دیا گیا۔ گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر مرحوم اس باغ کے بڑے مداح تھے وہ اکثر شام کو یہاں چہل قدمی کرتے تھے۔ انگریزوں نے یہاں کسی کو مذہبی عمارت بنانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ باغ میں کام کرنے والے مالیوں اور بیلداروں نے ایک تھڑا بنالیا تھا، جہاں وہ نماز ادا کرتے تھے۔ سردار عبدالرب نشتر مغرب کی نماز اکثر اسی تھڑے پر پڑھا کرتے تھے۔ سلطان علی نون ڈائریکٹر زراعت کے زمانے میں یہ تھڑا پختہ کرادیا گیا۔ بعد میں کرنل سلامت اللہ نے حکومت کو تجویز پیش کی کہ یہاں مسجد تعمیر کی جائے تو وہ تمام خرچ برداشت کریں گے۔ یہ تجویز بھی منظور کرلی گئی۔ ایک کمیٹی کے زیرِ نگرانی مسجد دارالسلام تعمیر کی گئی۔ مسجد کے ساتھ ہی ایک لائبریری اور ایک ریستوران بھی تعمیر کیے گئے۔ باغ جناح آج کل (1970ء) محکمہ زراعت کے زیرِ انتظام ہے۔ پانی کی بہم رسانی کے لئے نہری پانی کے علاوہ پانچ عدد ٹیوب ویل بھی نصب کیے گئے ہیں۔ محکمہ زراعت کا تجرباتی فارم تو اب ختم ہوگیا ہے۔ لیکن ایک نرسری موجود ہے جہاں باغ کے لئے چھوٹے پودے حفاظت سے تیار کیے جاتے ہیں۔ آج کل کوئی چھے سو مختلف اقسام کے درخت اور جھاڑیاں یہاں پائی جاتی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان کی کل تعداد اسی ہزار کے لگ بھگ ہے۔ یہاں برصغیر پاک و ہند میں پائے جانے والے عام درختوں مثلاً پیپل بڑ، آم

جامن، کیکر، نیم، بکائن، لسوڑا، شیشم اور سرس (شریں) کے علاوہ آسٹریلیا، جنوبی یورپ، شام اور سپین وغیرہ سے خوبصورت درخت منگوا کر لگائے گئے ہیں۔ پرانے درختوں پر ان کے نام کی تختیاں بھی نصب ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ پہاڑی علاقوں کے درخت مثلاً چیل، چنار، بلوط وغیرہ بھی نہایت کامیابی سے قائم ہیں۔ یوکلپٹس (سفیدہ) لیچی، کنو، خربوزہ اور سنبل کے درخت بھی خوب قد آور ہیں۔ باغ کے بوڑھے مالیوں سے معلوم ہوا کہ اس باغ میں لاہور کا قدیم ترین درخت بھی موجود ہے۔ چند اور درختوں کی نشاندہی بھی کی گئی جن کی عمر تین سو سال تک بتائی جاتی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد بہت سے نئے درخت بھی لگائے گئے۔ گلستان فاطمہ کے نزدیک ایک چمن بنایا گیا ہے جس میں گلاب کی ان گنت قسمیں لگائی گئی ہیں۔ لارنس روڈ پہاڑی کو آباد کیا گیا ہے۔ فضلی پہاڑی کی چوٹی پر سیر گاہ کو ترقی دی گئی ہے۔ سکندر پہاڑی کے نیچے ایک تالاب اور ایک آبشار بنائی گئی ہے۔ تالاب تین فٹ گہرا، اسی فٹ چوڑا اور ایک سو بیس فٹ لمبا ہے۔ اسی کے اوپر آبشار واقع ہے اور تالاب پر ایک چھوٹا سا خوبصورت پل بنایا گیا ہے۔ تالاب میں پانی کے نیچے بجلی کی روشنیاں بھی لگائی گئیں ہیں۔ باغ میں روشنی کے لئے پارے کے بخارات والے دودھیا لیمپ لگائے گئے ہیں۔ مختلف جگہوں پر پینے کے پانی کے لئے واٹر کولر نصب کیے جا رہے ہیں۔ بچوں کا پارک ترتیب دیا گیا ہے۔ آج کل (1970ء) مغل باغات کی طرز پر ایک قطعہ ترتیب دیا جا رہا ہے جس کا ایک مرحلہ مکمل ہو چکا ہے۔ باغ کا کل رقبہ پہلے 212 ایکڑ تھا۔ آج کل یہ 176 ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے۔ رقبے کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے:

عمارتوں اور سڑکوں کا رقبہ	17.25 ایکڑ
لاہور جم خانہ کلب	16.35 ایکڑ
عوام کے لیے استعمال	74.00 ایکڑ
باغ کے لیے	10.50 ایکڑ
چڑیا گھر کے لیے	8.00 ایکڑ
متفرق کلب وغیرہ	50.00 ایکڑ
کل	176,00 ایکڑ

باغ جناح میں واقع کلب پٹہ پر دی گئی زمین پر تعمیر کیے گئے ہیں اور انہیں خالی کرایا جا سکتا

ہے۔ اس وقت صرف 174 ایکڑ رقبہ عام لوگوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ محکمہ زراعت کے دفتر میں موجود ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ وقتاً فوقتاً باغ سے سرکاری تعمیرات کے لئے زمین حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ابھی تک باغ سے کوئی علاقہ مستقل طور پر نہیں لیا گیا۔ (1970ء) عوام کا دیرینہ مطالبہ ہے کہ اس عوامی تفریح گاہ سے کلبوں کو بے دخل کر دیا جائے۔ محکمہ زراعت کی فائلوں میں اس قسم کی بہت سی تجاویز موجود ہیں۔ محکمہ کی جانب سے یہاں ایک سپرنٹنڈنٹ مقرر ہیں۔ علاوہ ازیں زراعت کا تربیت یافتہ عملہ بھی موجود ہے۔ لاہور میں باغ جناح اور اقبال پارک کی دیکھ بھال اس دفتر کے سپرد ہے۔ شہر کے دیگر باغات لاہور کارپوریشن کے زیر انتظام ہیں۔ (1970ء)

باغ جناح میں واقع عمارات، کلب گراؤنڈ اور دیگر مقامات کی تفصیل اس طرح ہے:

عمارات

باغ جناح میں لارنس روڈ کی جانب سے داخل ہوتے ہی اوپن ایئر تھیٹر سے پہلے ایک پرانی عمارت ہے اس میں آج کل سپرنٹنڈنٹ زراعت کا دفتر ہے (1970ء)۔ پہلے یہاں بیج اور زراعتی سامان رکھا جاتا تھا۔ یہیں زراعتی سکول قائم ہوا۔ اس عمارت میں دفتر کے لئے جگہ بنائی گئی ہے۔ ایک حصے میں زرعی مشینری وغیرہ رکھی جاتی ہے۔ عمارت کے چاروں طرف گھنے اور خوبصورت درخت ہیں۔

مسجد دارالسلام پاکستان بننے کے بعد تعمیر کی گئی۔ یہ سفید سرخ اور سیاہ رنگوں کا امتزاج ہے۔ مسجد کا پستہ قد مینار اس سبزہ زار میں بڑا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سیاہ رنگ کے ستونوں اور محرابوں نے خاصی دلکشی پیدا کی ہے۔ مسجد کے سامنے دیوار پر آیات قرآنی اور کلمہ طیبہ تحریر ہے۔ مسجد کے سامنے وسیع صحن واقع ہے۔

مسجد کے ساتھ ہی لائبریری کی عمارت ہے جو اسی طرز پر بنائی گئی ہے۔ مسجد اور لائبریری کا خرچ برداشت کرنے کے لئے ریستوران کو سالانہ ٹھیکہ پر دیا جاتا ہے۔ گورنمنٹ ایڈوائیزری کمیٹی اس کا انتظام سنبھالتی ہے۔ اس کمیٹی میں شہر کے معززین بھی شامل ہیں۔ لائبریری میں زیادہ تر اسلامی اور تاریخی کتابیں رکھی جاتی ہیں۔ روزانہ اخبارات بھی منگوائے جاتے ہیں۔

مسجد اور لائبریری کے سامنے گلشن ریستوران واقع ہے۔ طرز تعمیر مسجد دارالسلام سے ملتی جلتی ہے۔ عمارت کے سامنے وسیع لان ہے جو شام کو سیر و تفریح کے لیے آنے والوں سے بھرا رہتا ہے۔ اس

ریستوان کو ہر سال ٹھیکہ پر دیا جاتا ہے اور یہ رقم مسجد اور لائبریری کے خرچ کے لئے وقف ہے۔ پہلے یہاں ایک عارضی عمارت تھی جواب گرادی گئی ہے۔

ریستوران کے نزدیک ہی گلستان فاطمہ ہے۔ یہ باغ کا خوبصورت ترین حصہ ہے۔ اس کے تین قطعات ہیں۔ پہلے قطعے کے لئے سڑک سے کوئی چار فٹ نیچے اترنا پڑتا ہے۔ یہاں سے مزید تین فٹ نیچے ایک چھوٹا سا باغیچہ ہے۔ یہاں بیٹھنے کے لئے سفید سفید کرسیاں لگی رہتی ہیں۔ آگے جانے کے لیے اینٹوں کی چنائی کا ایک گول دروازہ ہے جہاں سے گلستان کے آخری قطعے میں داخل ہوا جاتا ہے۔ اس قطعہ میں ایک خوبصورت فوارہ اور حوض ہے۔ باغ کی دیوار کے ساتھ ایک سٹیج ہے جس کی چھت پر پھولدار بیلیں چڑھائی گئیں ہیں۔ گلستان فاطمہ میں ہر سال عید کے موقع پر عید ملاپ پارٹی منعقد کی جاتی تھی۔ جس میں میں لاہور کے شہری گورنر سے عید ملتے تھے۔ گلستان فاطمہ کو دیکھ بھال اور آبپاشی کی غرض سے ہفتہ میں دو دن بند رکھا جاتا ہے۔

مغل گارڈن

قیام پاکستان کے بعد یہ اس باغ میں ایک قابل ذکر اضافہ ہے۔ جم خانہ کرکٹ گراؤنڈ کے نزدیک ایک پلاٹ میں شالامار باغ کے نمونے پر ایک باغیچہ ترتیب دیا گیا ہے۔ اس قطعے کے ایک سرے پر بارہ دری تعمیر کی گئی ہے اور اس کے سامنے مغلیہ باغات کی طرز پر نہریں اور دورویہ روشیں بنائی گئی ہیں۔ اگرچہ یہ کوشش کامیاب نظر نہیں آتی لیکن تھوڑی سی محنت اور تبدیلی کے بعد اسے بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ ابھی تک اس منصوبے پر دو لاکھ روپے خرچ کیے جاچکے ہیں (1970ء)۔

ان عمارات کے علاوہ باغ کے رقبے میں جو عمارات ہیں ان میں نرسری، ریسٹ ہاؤس، سپرنٹنڈنٹ کی رہائش گاہ، کھیلوں کی عمارات، تھیٹر اور مویشیوں کے لئے سٹینڈ شامل ہیں۔

اوپن ایئر تھیٹر

لارنس روڈ کی جانب ایک پہاڑی پر اوپن ایئر تھیٹر بنایا گیا ہے۔ یہاں سٹیج پر چار درخت بھی موجود ہیں۔ (1970ء) سٹیج کے ساتھ ہی تھیٹر کی چھوٹی سی عمارت ہے، سامنے سیڑھیاں ہیں جہاں تماشائی بیٹھتے ہیں۔ یہ نصف دائرے کی شکل میں بنائی گئی ہیں۔ پشت پر ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جہاں سٹیج پر روشنی

ڈالنے کا انتظام ہے۔ یہ تھیٹر انگریزوں نے شیکسپیئر کے ڈرامے سٹیج کرنے کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے گورنمنٹ کالج کی ڈرامیٹک سوسائٹی کی جانب سے پروفیسر سوندھی نے پنجاب کے میلوں کے چند مناظر پیش کیے تھے جو لاہور میں بہت مقبول ہوئے۔ دیہاتیوں کا ایک گروہ چمٹا بجاتا اسٹیج پر آتا۔ دوسری جانب سے جاٹ، باگڑیاں اور بالو گاتے نمودار ہوتے۔ کچھ کسان لکڑی کی گلہریاں بجاتے اور بولیاں بولتے دکھائی دیتے تھے۔ کچھ پنجابی شیر جوان کلائی پکڑنے اور چھڑانے کا تماشا کرتے تھے اور کہیں وارث شاہ کی ہیر پڑھی جا رہی تھی۔ یہ پروگرام اس قدر پسند کیا گیا کہ بعد میں پنجاب ڈرامہ لیگ نے یہاں انعامی ڈرامے پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ پروفیسر سوندھی نے شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے مڈسمر نائٹ ڈریم کا اردو ترجمہ پیش کیا۔ پھر کینیرڈ کالج کی ڈرامہ کلب نے بھی یہاں کچھ کھیل پیش کیے۔ یہ تھیٹر پروفیسر سوندھی کی ایما پر ہی قائم کیا گیا تھا۔ اس ٹیلہ پر جھاڑ جھنکار کو صاف کرا کر زمین ٹھیک کی گئی۔ نقشہ تیار کرایا گیا اور 20 دسمبر 1920ء کو پنجاب کے گورنر سر ہنری کریک نے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ کام کچھ عرصہ بعد رک گیا کیوں کہ چندہ ختم ہو گیا تھا۔ رقم اکٹھی ہونے پر تعمیر کا کام دوبارہ شروع ہوا۔ اس پہاڑی پر پختہ سٹیج، سیڑھیاں، بارہ دری، برآمدہ اور مغل طرز کی جالیاں لگائی گئیں۔ اس تھیٹر میں ایک ہزار تماشائیوں کی گنجائش رکھی گئی۔ بجلی کے کنٹرول روم کی پشت پر لکھا گیا، ''عوام کے لئے عوام نے تعمیر کیا۔'' اس کے بعد یہاں بہت سے معرکتہ الآرا کھیل پیش کیے گئے۔ 1945ء میں تارا چوہدری اور سادھنا بوس کے رقص دیکھنے کے لئے زبردست ہجوم تھا۔ اپریل 1947ء میں لٹل تھیٹر گروپ نے اپنا ڈرامہ ''سوسائٹی کے ٹھیکیدار'' پیش کیا۔ اس کے بعد لاہور میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے اور تھیٹر غیر معینہ مدت کے لئے بند کر دیا گیا۔

لاہور کے حالات جب مخدوش ہو گئے تو پروفیسر سوندھی نے اپنی کوٹھی کا سارا سامان اوپن ایئر تھیٹر کے نیچے گودام میں بند کرا دیا۔ پاکستان بننے کے بعد جب حالات ٹھیک ہو گئے تو وہ آ کر سارا سامان صحیح سالم واپس لے گئے۔ 1947ء کے بعد پنجاب ڈرامہ لیگ کے پاس خرچ کی کمی ہو گئی اور تھیٹر محکمہ زراعت کو واپس دے دیا گیا جس سے یہ پٹہ پر حاصل کیا گیا تھا۔ چار پانچ سال غیر یقینی کی حالت میں رہنے کے بعد اسے دوبارہ حاصل کیا گیا۔ اس بار شہر کے مختلف اداروں نے یہاں ثقافتی شو منعقد کیے۔ بیرونی ممالک سے آنے والے ثقافتی طائفے بھی اکثر یہاں مظاہرہ کرتے ہیں۔ کل پاکستان میوزک کانفرنس بھی یہیں ہوتی ہے۔ آج کل یہاں کوئی نہ کوئی ڈرامہ یا ثقافتی پروگرام ہوتا رہتا ہے۔

لاہور جم خانہ (یہ 1979ء کے حالات ہیں اب یہ جگہ قائداعظم لائبریری ہے)

لاہور جم خانہ شہر کا سب سے بڑا کلب ہے۔ایک اندازے کے مطابق ممبروں کی تعداد بارہ سو کے لگ بھگ ہے۔کلب کے زیرانتظام کئی قسم کے کھیل یہاں کھیلے جاتے ہیں۔لاہور جم خانہ کواس لحاظ سے تاریخی حیثیت حاصل ہوگئی ہے کہ ستمبر 1965ء میں انڈین آرمی کے کمانڈرانچیف جنرل چوہدری نے اپنے فوجیوں سے وعدہ کیا تھا کہ لاہور چل کر جمخانہ میں شراب پارٹی کا انتظام کیا جائے گا۔لاہور جم خانہ کلب کی سب سے بڑی تقریب 31دسمبر کو نئے سال کا رقص ہے۔انگریزوں کی دورحکومت میں کرسمس کی چھٹیوں میں یہاں دوردور سے انگریز آتے تھے اور تمام رات جشن بپا رہتا تھا اس روایت کو برقرار رکھا گیا ہے۔لاہور جم خانہ کلب میں ایک لائبریری بھی ہے جس میں کم بیش تیس ہزار کتابیں ہیں۔پہلے یہاں صرف انگریزی کتابیں آتی تھیں لیکن اب اردو کتابیں بھی منگوائی جاتی ہیں۔یہ لائبریری صرف ممبروں کے استعمال کے لئے ہے۔کلب کے تحت کھیلے جانے والے کھیلوں میں ٹیبل ٹینس، بلیئرڈ، کارڈز، شطرنج، کیرم بورڈ وغیرہ کا انتظام ہے۔لان ٹینس کے لئے تیئس (23) کورٹ استعمال ہوتے رہے ہیں۔آج کل صرف چھ استعمال ہورہے ہیں۔ہاکی کرکٹ اور دیگر کھیلوں کا بھی انتظام ہے۔لاہور جم خانہ کی عمارت باغ جناح کی سب سے پرانی عمارتوں میں سے ہے۔اسے منٹگمری ہال اور لارنس ہال کہا جاتا ہے۔

لارنس ہال 62-1861ء میں پنجاب کی یورپین آبادی کے چندے سے سرجان لارنس کی یادگار کے طور پر تعمیر کیا گیا۔اس کا نقشہ جی سٹونسول انجینئر نے بنایا ہے۔منٹگمری ہال 1868ء میں پنجاب کے رئیسوں اور نوابوں، مہاراجوں کے چندے سے سررابرٹ منٹگمری کی یادگار کے طور پر تعمیر کیا گیا۔اس کا نقشہ جے گارڈن سول انجینئر آرکی ٹیکٹ نے بنایا تھا۔لارنس ہال کی پیمائش 31.5 تا 65 فٹ ہے۔فرش لکڑی کا ہے اسے اسمبلی ہال کی صورت میں لارنس کی یادگار کے طور پر تعمیر کیا گیا۔منٹگمری ہال کی پیمائش 106x46 فٹ ہے۔لارنس ہال پر 34 ہزار روپے صرف ہوئے اور منٹگمری ہال پر ایک لاکھ 74 ہزار روپے خرچ کیے گئے۔عمارت کلاسیکی یونانی طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔فرش پر دیودار کی لکڑی کے تختے لگے ہوئے ہیں۔چھت پر ہلکے نیلے رنگ سے نہایت خوبصورت نقش ونگار بنائے گئے ہیں۔منٹگمری ہال کی چھت کمزور

ثابت ہونے پر اتار دی گئی تھی اور دوبارہ تعمیر کی گئی تھی۔ تمام عمارت پر چونے کا پلاسٹر ہے اور مناسب مرمت کی وجہ سے بڑی اچھی حالت میں ہے۔ یہ عمارت کلب کی ملکیت نہیں ہے بلکہ حکومت سے عاریتاً حاصل کی گئی ہے۔ منٹگمری ہال کے ایک دروازے کے دونوں طرف سنگ مرمر کی دو تختیاں نصب ہیں جن میں سے ایک پر اردو اور دوسری پر دیوناگری رسم الخط میں چندہ دینے والوں کے نام درج ہیں۔ اردو تختی پر یہ عبارت کندہ ہے۔ ''فہرست نام ہائے نامی مہاراجگان ورئیسان کی جنہوں نے جناب نواب سر رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر کے سی بی کے سی اسی سی لیفٹیننٹ گورنر سابق پنجاب مربی اپنی یادگار کی تیاری کے واسطے رضا مندی وخوشی خاطر سے مدد کی ہے۔ بنائے تعمیر در 1865ء عیسوی اختتام تعمیر 1876ء سقف خشتی اصلی در 1873ء شق شدہ سقف جدید چوبی در 1874ء با اہتمام رائے کنہیالال صاحب بہادر ایگزیکٹو انجینئر لاہور تیار کردید درعین حکومت سر ڈی ایف میکلوڈ صاحب سی بی کے ایس اے لیفٹیننٹ گورنر ممالک پنجاب وغیرہ تمام یافت سقف چوبی درعین حکومت سر ہنری ڈیویز صاحب بہادر کے سی ایس آئی لیفٹیننٹ گورنر ممالک پنجاب وغیرہ 1874ء تمام یافت با اہتمام جان گارڈن صاحب بہادر سول انجینئر وآرکیٹکٹ لالہ میلہ رام ٹھیکہ دار۔'' اس کے علاوہ پنجاب کے روسا، نوابین اور مہاراجوں نام بھی درج ہیں جنہوں نے چندہ دیا تھا۔

جم خانہ کرکٹ گراؤنڈ

لاہور جم خانہ کرکٹ کلب کے پاس ایک بہت پرانی کرکٹ گراؤنڈ ہے جہاں گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے کرکٹ کھیلی جارہی ہے۔ اس وکٹ پر پہلے ٹسٹ میچ کرکٹ کھیلنے کا انتظام نہیں تھا۔ لارنس گارڈن کی ترتیب کے دوران یہاں ایک پلاٹ کرکٹ کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ 1898ء میں یہاں ایک نہایت خوبصورت پویلین تیار کیا گیا۔ کرکٹ کے لئے وکٹ بنائی گئی اور اسے بین الاقوامی معیار پر لانے کے لئے آسٹریلیا سے کالی مٹی منگوائی تھی۔ یہ مٹی تین فٹ گہری دبائی گئی۔ باغ جناح کی وکٹ پر دنیا کے نامور کھلاڑیوں نے کرکٹ کھیلی ہے اور اس کی تعریف کی ہے۔ یہ وکٹ ''بیٹس مین کی جنت'' مشہور ہے۔ یہاں سکور نہایت تیزی سے ہوتا ہے اور فاسٹ بالر اکثر ناکام رہتے ہیں۔ جناح باغ کی وکٹ پر کرکٹ کی تاریخ کے بڑے دلچسپ واقعات پیش آئے ہیں جن کو ترتیب دے کر ایک کتاب لکھی جاسکتی

ہے۔1956ء میں ہندوستان سے کرکٹ ٹیم لاہور ٹسٹ میچ کھیلنے آئی تو کوئی اسی نوے ہزار کا مجمع تھا۔ بہت سے لوگ جگہ نہ ملنے کی وجہ سے میچ نہ دیکھ سکے۔ اس وقت لاہور سٹیڈیم کی ضرورت کا احساس ہوا۔ اس وکٹ پر آخری ٹسٹ میچ مارچ1959ء میں پاکستان اور ویسٹ انڈیز کی کرکٹ ٹیموں کے درمیان ہوا۔ اس میچ میں دنیا کا سب سے کم عمر ٹسٹ کھلاڑی مشتاق محمد پہلی بار ٹسٹ میچ میں کھیلا، اس وقت اس کی عمر 14 سال تھی۔ ویسٹ انڈیز کے فاسٹ بالر ہال کی کامیاب بولنگ عرصہ تک لوگوں کو یاد رہی۔ اس نے لگاتار تین گیندوں میں تین وکٹیں لے کر ہیٹ ٹرک کیا۔ کھیل کے آخری دن بارش کی وجہ سے وکٹ خراب ہو رہی تھی اور پاکستان جم کر نہ کھیل سکا۔ اس ٹسٹ میچ میں پاکستان کی ٹیم ایک اننگز اور 154 رنز سے ہار گئی۔ پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان اس تاریخی ٹسٹ میچ کے بعد کوئی اور ٹسٹ اس وکٹ پر نہیں ہوا۔ البتہ جم خانہ کلب ٹیم کے میچ اس پر اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ قائداعظم ٹرافی کے میچ بھی ہوتے ہیں۔ ایم سی سی (برطانوی) ٹیم جب کبھی پاکستان آتی ہے، بڑی فرمائش سے اس وکٹ پر پریکٹس کرتی ہے۔ اس مشہور عالم وکٹ کی خصوصیات اب مستقل ہو چکی ہیں اور کھلاڑی اس کا مزاج سمجھتے ہیں۔ جم خانہ کرکٹ گراؤنڈ کا پویلین بھی ایک قابل دید مقام ہے۔ یہ عمارت نہایت شاندار سرخ بنگلوری ٹائل اور لکڑی سے بنائی گئی ہے۔ یہ وکٹورین عہد کے فن تعمیر کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ اس پویلین میں دنیا بھر کے مایہ ناز کھلاڑیوں نے آرام کیا ہے۔1869ء سے 1959ء تک کے تمام میچوں کے گروپ فوٹو بھی یہاں موجود ہیں۔1869ء کی ایک یادگار تصویر میں انگریز کھلاڑی نظر آتے ہیں جو کرسمس کی چھٹیوں میں تمام پنجاب سے لاہور آجاتے تھے اور یہاں کرکٹ کے میچ کھیلتے تھے۔ اس عمارت میں کھیلوں کے سامان کا سٹور، آرام گاہ اور غسل خانے وغیرہ موجود ہیں۔

ہاکی گراؤنڈ

باغ جناح کی ہاکی گراؤنڈ بھی بہت مشہور ہے۔ یہاں اکثر ملکی اور غیر ملکی ٹیموں کے میچ اور ٹورنامنٹ ہوتے رہتے ہیں۔ سال میں ایک مرتبہ ریڈ کراس میلہ بھی یہیں لگتا ہے۔ پہلے زرعی نمائش اور ڈاگ شو کے لئے بھی یہی گراؤنڈ استعمال کی جاتی تھی۔

کلب

باغ جناح میں لاہور جم خانہ کے علاوہ بھی کلب موجود ہیں۔ ان میں سب سے بڑا لاہور کمرشل جم خانہ ہے۔ لاہور جم خانہ زیادہ تر انگریز افسروں اور یورپین آبادی کے لئے بنایا گیا تھا۔ شہر کے مقامی تاجروں نے کمرشل جم خانہ قائم کیا۔ کاسموپولیٹن کلب ہندوؤں نے بنایا تھا۔ اس کا مقصد ہندوؤ تاجروں اور انگریزوں کو نزدیک لانا تھا۔ اس کے مقابلے میں مسلم کلب نے جو پہلے گول باغ میں تھا حکومت سے لارنس گارڈن میں جگہ دینے کی درخواست کی، حکومت نے نام بدلنے کو کہا اور اس طرح اورینٹ کلب قائم ہوا۔ علاوہ ازیں لیڈیز کلب خواتین کو تفریح مہیا کرنے کے لئے قائم کیا گیا۔ ان تمام کلبوں نے باغ کے وسیع قطعات پٹے پر حاصل کیے ہوئے ہیں اور کچھ کی اپنی عمارات بھی ہیں۔

قبریں

باغ جناح کی حدود میں تین مزاروں کا پتا چلا ہے۔ ان میں سے ایک شاہراہ قائداعظم پر گورنمنٹ ہاؤس کے بالمقابل ایک پارک میں ہے جہاں بچوں کے لئے جھولے وغیرہ لگائے گئے ہیں۔ یہ ایک ہشت پہلو عمارت ہے جس پر مدور گنبد ہے۔ ایک بلند چبوترے پر یہ عمارت واقع ہے اور دروازے پر ایک تختی پر تحریر ہے:

''دربار عالیہ حضرت شرف الدین پاک خلیفہ سوئم سید غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی''

اس مزار کو عوام بابا گمٹی پیر کا دربار کہتے ہیں۔ ستمبر کے مہینے میں یہاں عرس ہوتا ہے۔ انگریزوں کی حکومت میں یہاں قوالی وغیرہ کی ممانعت تھی کیوں کہ گورنمنٹ ہاؤس بالکل نزدیک تھا۔ آج کل کوئی پابندی نہیں ہے۔ عقیدت منداکثر نذریں چڑھانے دور دراز سے آتے ہیں۔

دوسرا مزار باغ جناح کے سپرینٹنڈنٹ کے دفتر کے نزدیک اس سڑک پر واقع ہے جو پہلے چڑیا گھر سے باغ جناح کو آتی تھی اسے ''ترت پیر کی خانقاہ'' کہا جاتا ہے۔ اس قدیم قبر پر کوئی عمارت باقی نہیں۔ تعویذ روغنی ٹائل کا ہے جس پر تحریر ہے: ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، ترت مراد شاہ صاحب نقشبندی

رحمتہ اللہ علیہ 1245ھ''۔اس لحاظ سے یہ قبر کوئی 145 سال پرانی ہے (1970ء)۔باغ جناح میں ایک اور قبر ہے جسے ''مائی صاحب کی خانقاہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ گلستان فاطمہ کے پیچھے واقع ہے اور اسے مائی حبیب بیگم مجاورہ مزار ترت کی قبر بتایا جاتا ہے۔

پرانے درخت

میں نے باغ کے پرانے مالیوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ باغ جناح میں چند صدیوں پرانے درخت موجود ہیں۔ سب سے پرانا ساڑھے تین سو سالہ برگد کا درخت خانقاہ ترت پیر کے نزدیک ہے جس پر چمگادڑیں لٹکی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ چڑیا گھر میں بھی بہت پرانے درخت ہیں۔ کرکٹ گراؤنڈ کے نزدیک بھی پیپل، سنبل اور چیل کے قدیم درخت ہیں۔ بابا گمٹی پیر کے مزار کے نزدیک برگد کا بہت پرانا درخت ابھی تک موجود ہے۔

باغ جناح شروع ہی سے لاہور کے ماحول کا ایک زندہ حصہ رہا ہے۔ یہاں نئے نئے ریکارڈ قائم ہوئے ہیں اور اس کے قدیم درخت اور پھولوں کے کنج بڑے حسین رازوں کے امین ہیں۔ یہاں علامہ اقبال بھی چہل قدمی کرتے دیکھے گئے ہیں۔ اختر شیرانی نے بھی جانے کہاں کہاں بیٹھ کر خیالوں کی دنیا میں سیر کی ہوگی۔ قیام پاکستان سے پہلے پنڈت جواہر لال نہرو جب بھی لاہور آتے اس باغ کی سیر ضرور کرتے تھے انہیں یہ باغ بے حد پسند تھا۔ سردار عبدالرب نشتر نے اپنی شامیں گزارنے کے لئے گورنمنٹ ہاؤس کی بجائے اس باغ کا انتخاب کیا تھا اور محترمہ حجاب امتیاز علی کی یہ تحریر تو پڑھیے:

''لمبے لمبے روشن اور نیم روشن، تاریک اور نیم تاریک خوابناک راستے، فلک بوس بوڑھے درخت، پھولوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں، پراسرار روشیں ان پر رکھے ہوئے بینچ، دوسری طرف گلستان فاطمہ کی ہوشربا فضائیں، ساتھ والے ریستوران کا والہانہ ماحول، فلمی موسیقی کی دھنیں، دیو قامت درختوں کی ٹہنیوں میں سے لاہور کی کئی بڑی بڑی کلبوں میں جگمگانے والی تاروں جیسی روشنیاں، اوپن ایر تھیٹر کا زندگی کی طرح پیچیدہ اور موت کی طرح خاموش راستہ، گلاب وسوسن کی نکہتیں باغ جناح میں عطر گل میں ملفوف دیوانی ہوائیں، پھولوں کے سائے میں ٹھنڈی گھاس پر نیم دراز کسی ناکام محبت کا رسیلا گیت، غرض یہاں پہنچ کر میں لاہور کی راتوں کی شعریت اور حسن خوابناکی کی قائل ہوگئی۔''

لاہور کے باشندے اپنے شہر سے پیار کرتے ہیں۔ باغ جناح تو پھر لاہور کی جنت ہے۔ موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق باغ میں کئی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔ اجمالی طور پر مندرجہ ذیل اقدام اس سلسلے میں کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ (1970)

1- لاہور کی بڑی بڑی کلبوں کو ان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق نئی جگہوں پر منتقل کیا جائے اور باغ جناح صرف عوام کے لئے مخصوص کیا جائے۔

2- ایک سے زیادہ ریستوران قائم کیے جائیں تاکہ کھانے پینے کی چیزیں معیار اور قیمت کے لحاظ سے مناسب رہیں۔

3- سائیکل سواروں کو باغ میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے موثر انتظامات کیے جائیں۔

4- باغ کی ایڈوائزی کمیٹی میں شہریوں اور سرکاری افسروں کے علاوہ فن تعمیر کے ماہرین کو بھی شامل کیا جائے تاکہ وہ باغ کی تربیت وتزئین کو سائنسی خطوط پر سرانجام دے سکیں۔

5- جم خانہ کرکٹ پویلین میں لارڈز کی طرح کرکٹ میوزیم قائم کیا جائے جہاں اس کھیل کی ڈیڑھ سوسالہ تاریخ میں پیش آنے والے واقعات کا ریکارڈ اور نوادرات رکھے جائیں۔

6- جم خانہ کلب منتقل ہونے پر لارنس ہال اور منٹگمری ہال کو پبلک ہال بنایا جائے۔ اس جگہ شہری عوامی ثقافتی تقریبات منعقد کرنے کے انتظامات کیے جائیں۔

7- لارنس روڈ پر واقع بے آباد ٹیلے پر ایک گھومنے والا ریستوران بنایا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے ریستوران سیاحوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔

8- بچوں کے لئے مزید پارک بنائے جائیں جہاں کھیل کود کا سامان مہیا کیا جائے۔

9- باغ کی کھلی فضا میں فی الحال پڑھنے کا کوئی انتظام نہیں۔ دوسرے ممالک میں ایسے مقامات پر لائبریریاں، باہر بیٹھ کر کتابیں وغیرہ پڑھنے کے انتظامات کرتی ہے۔ باغ جناح میں اس قسم کی کھلی لائبریری قائم ہونی چاہیے۔

10- شام کے وقت بینڈ ڈسپلے کی رسم دوبارہ شروع کی جائے۔ اس سے لوگوں میں باغ کی سیر کا رجحان بڑھے گا۔

11- گورنمنٹ کالج بوٹانیکل گارڈن کو چڑیا گھر کی طرح ایک تعلیمی معلوماتی تفریح گاہ بنایا جا سکتا ہے۔

12- پینے کے پانی، کوڑا کرکٹ پھینکنے اور روشنی کے انتظامات بہتر کیے جائیں۔ عوام کے لئے دیگر سہولیات مثلاً بارش اور دھوپ سے محفوظ سائیکل سٹینڈ، مناسب قیمت پر چیزیں فروخت کرنے والی دکانیں اور تماشا گاہیں بھی فراہم کی جاسکتی ہیں۔ باغ جناح مستقبل میں لاہور کے شہریوں کے لئے تفریح کے مزید مواقع فراہم کرسکتا ہے۔ لاہور اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ ایشیا کا ایک بہترین باغ اس کے حصے میں آیا۔ جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرکے ہم اسے اور بھی عمدہ بنا سکتے ہیں۔ باغ ہمیشہ سے لاہور کی ایک خصوصیت رہے ہیں۔ باغوں کا شہر کا سب سے بڑا باغ گزشتہ ایک صدی سے زندہ دلوں کے لئے تفریح و تسکین کے سامان فراہم کرتا رہا ہے۔ آپ بھی کسی دن وہاں جا کر بوڑھے درختوں سے کچھ راز کی باتیں کچھ گلے شکوے سن لیجئے یہاں ایک نہیں ہزاروں افسانے پروان چڑھے ہیں۔

○

لاہور کے میلے

زندہ دلوں کے شہر میں......سات روز میں آٹھ میلے لگتے ہیں

لاہور کے متعلق ایک روایت مشہور ہے کہ یہ وہ شہر ہے جہاں ہفتے کے سات دنوں میں آٹھ میلے ہوتے ہیں ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ پچیس تیس سال قبل ایک ڈھنڈورچی جب کسی میلے کے انعقاد کی منادی کیا کرتا تھا تو کہا کرتا تھا کہ:

سجنو اے لاہور اے
ست دن تے آٹھ میلے
گھر جاواں کہیڑے ویلے

اب نہ وہ منادی کرنے والا سائیں رہا نہ ڈھنڈورے کا رواج لیکن اس کے ڈھنڈورے کی بازگشت آج بھی میلوں ٹھیلوں کے موقعوں پر جمع ہونے والے شائقین کی تعداد اور تفریح پسندی میں موجود ہے۔ یہ میلے دو اقسام کے ہیں ایک موسمی میلے اور دوسرے ثقافتی میلے۔

پنجاب کے موسمی میلوں میں سب سے زیادہ بیساکھی مشہور ہے۔ لاہور میں بھی یہ میلہ کبھی بڑے جوش وخروش سے منایا جاتا تھا۔ یہ پنجاب کا قدیم ترین میلہ ہے۔ ثقافتی میلے وہ ہوتے ہیں جو عموماً عرس پر یا اسی طرح کی اور تقریبات کے سلسلے میں منعقد ہوتے ہیں۔

میلوں کے انتظامات مہینوں پہلے شروع ہو جاتے ہیں۔ لاہور کے میلوں میں سب سے زیادہ مقبولیت میلہ چراغاں کو حاصل ہے۔ یہ عموماً مارچ کے آخری ہفتے میں ہفتے یا اتوار کو منایا جاتا ہے۔ سالہا سال سے مغل شہنشاہ شاہجہان کے معروف باغ شالامار میں نہ صرف اہالیان شہر بلکہ دور دراز اور

گردونواح سے شائقین جوق در جوق اس میں شمولیت کے لئے آتے ہیں۔ رمضان میں اس کی تاریخ بدل دی جاتی ہے۔ یہ میلہ شان وشوکت اور چہل پہل کے اعتبار سے منفرد مقام رکھتا ہے۔ درگاہ مادھولال حسین پر بے شمار چراغ روشن کیے جاتے ہیں اور شالامار باغ میں بھی چراغاں ہوتا تھا۔ چراغوں کی روشنی اور برقی قمقموں کی وجہ سے سارے کا سارا علاقہ بقعہ نور بن جاتا ہے۔ اسی نسبت سے اسے میلہ چراغاں کہتے ہیں۔ رات کے وقت جب باغ کے درمیان بہتی ہوئی پانی کی چھوٹی چھوٹی نہروں میں چراغوں اور قمقموں کی روشنی پڑتی تھی تو عجیب پر کیف منظر ہوتا تھا۔ فواروں میں سے فضا میں بکھرے ہوئے پانی پر جب روشنی پڑتی ہے تو لگتا تھا کہ جیسے پانی کی بوندیں نہیں موتی ادھر ادھر برس رہے ہیں۔ درختوں بوٹوں میں لگے ہوئے برقی قمقمے اور تماشائیوں کے رنگارنگ ملبوسات کی بوقلمونی سے یہ باغ پرستان بن جاتا تھا۔ دیہاتیوں کے گروہ اور ٹولیاں ساری ساری رات اور سارا سارا دن چمٹے اور ڈھول کی تال پر لوک گیت گاتے، بولیاں بولتے اور بھنگڑا ناچتے ادھر سے ادھر پھرتے ہیں۔ بچے بوڑھے جوان ہر عمر کے لوگ، بے تکلف بھنگڑے میں حصہ لیتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بھنگڑا ایک بے تکلف پنجابی ناچ ہے جو دیہاتیوں کو بہت مرغوب ہے۔ ناچنے والے بالعموم ناچتے وقت پنجابی کا کوئی مصرع آہستہ آہستہ دھراتے ہیں جس میں ناچ کی ساری حرکات بند ہیں، وہ مصرع اکثر یہ ہوتا ہے:

آپیرا ایتھے تے آپیرا اوتھے

یعنی یہ پیر یہاں اور یہ پیر اس جگہ پر۔ ذرا غور کرنے سے ناچ کی ساری حرکات سمجھ میں آسکتی ہیں۔ جیسے جیسے ڈھول کی آواز میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے ناچنے والے کے پاؤں اتنی ہی تیزی سے زمین سے اٹھتے اور گرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناچنے والوں کے پاؤں زمین پر پڑ ہی نہیں رہے بلکہ ہوا میں ہی رہتے ہیں۔ یہ لوک ناچ عموماً خوشی کے اظہار کے لئے ہوتا ہے۔ ناچ کے دوران کچھ ''بولیاں'' بھی لگائی جاتی ہیں۔ جب کوئی شخص بولی لگانے کے لئے میدان میں آتا ہے تو چند لمحوں کے لئے ناچ رک جاتا ہے لیکن جونہی بولی ختم ہوئی تو پھر وہی سلسلہ شروع۔ آپیرا تے آپیرا! بھانڈ سوانگ بھرتے ہیں۔ گانے والیاں جمع ہوتی ہیں۔ پہلے دکانیں باغ کے اندر لگائی جاتی تھیں لیکن اب باغ کے باہر لگتی ہیں۔ دیہاتی اپنے اپنے علاقے سے دوستوں کے ہمراہ ٹولیوں میں بھنگڑا اور لڈی ناچتے ہیں۔ ڈھول اور چمٹہ بجاتے گالڑاں لہراتے، بولیاں بولتے آتے ہیں اور پھر اسی صورت میں میلے کے اختتام پر واپس جاتے ہیں۔

بولیاں اس قسم کی ہوتی ہیں:

کھٹن چلیا تے کھٹ کے لیاندا کیہ
کھٹ کے لیاندے پیڑے
تیرے وچ جناں دے ڈیرے
گوری نہا کے چھپڑ وچوں نکلی
سلفے دی لاٹ ورگی
کاہنوں ڈاہنی ایں گلی وچ چرخہ
بہتیاں دے خون ہون گے

بسنت کا میلہ بھی لاہوریوں کی دلچسپی کا باعث ہے اور لاہور کے میلوں میں سے ایک ہے۔ پہلے یہ میلہ باقاعدہ طور پر درگاہ مادھولال حسین پر لگتا تھا۔ یہ عموماً جنوری یا فروری میں ہوتا ہے۔ دور دور سے لوگ لاہور کے اس میلے میں شامل ہونے آتے تھے اور درگاہ پر نذرانے اور چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ حضرت حسین کا بسنت کے ضمن میں ایک معروف شعر بھی ہے:

رت آئی بسنت بہار دی
سانوں سک اے مادھو یار دی

لوگ ٹولیوں کی صورت میں ناچتے اور "میرا رنگ دے بسنتی چولا" گاتے پھرتے ہیں۔ اب بھی اندرون شہر نوجوان کوٹھوں پر پتنگ بازی کرتے ہیں اور صبح سے شام تک کئی لاکھ روپے اور کئی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔

قدموں کا میلہ بھی یہاں کے میلوں میں سے ایک ہے۔ روضہ رسول مقبول کے مجاوروں میں سے ایک بزرگ زین العابدین، سلطان ناصر الدین محمود بن التمش کے زمانے میں ہندوستان سے آئے اور ملتان سے تیرہ میل دور قصبہ شاہ کوٹ اقامت گزیں ہوئے۔ یہاں ان کے ہاں دو فرزند تولد ہوئے، چھوٹے کا نام سید احمد تھا۔ یہ بچپن سے نہایت ذہین تھے۔ حصول علم کے لئے لاہور آئے اور یہاں کے علماء اور فضلاء سے فیض حاصل کیا۔ آپ کا حجرہ اب تک شاہ عالمی دروازے کے باہر موجود ہے۔ بخشش

اور سخاوت کی بناء پر لوگ سخی سرور کہتے تھے۔ پھر وہ سیر کی غرض سے شہر بہ شہر قریہ بہ قریہ گھومتے ہوئے بغداد گئے۔ وزیر آباد کے قریب قصبہ دھونکل میں کچھ کرامات ظاہر کیں وہاں ان کی یادگار کے طور پر ایک مسجد چشمہ اور تالاب اب تک قائم ہیں۔ آپ کا مزار ڈیرہ غازی خان میں ہے۔ درہ سخی سرور جہاں سے پہلے بڑے پیمانے پر تجارت ہوتی تھی، آپ ہی کے نام پر ہے۔ قدموں کا میلہ انہی بزرگوں کے نام پر لگتا ہے۔ میلے کے اصل دن چار ہیں، 10 اپریل سے 13 اپریل تک، ان کے عقیدت مندوں کو سنگ کہا جاتا ہے۔ اس میلے کے موقع پر ڈھول بجانے والے دیہاتی جنہیں لوگ عموماً شیخ کہتے ہیں آتے ہیں۔ آستانے پر حاضری دیتے ہیں اور زور زور سے ڈھول بجا بجا کر ناچتے اور ''پھمنیاں'' کا رقص کرتے ہیں۔ روایت ہے کہ سخی سرور کو بچوں سے بہت انسیت تھی۔ وہ بچوں کے مربی مانے جاتے ہیں۔ اس موقع پر عورتیں اپنے بچوں کو لے آتی ہیں۔ ڈھول بجانے والے بچوں کو گود میں لے کر عجیب انداز میں ناچتے ہیں اور ساتھ ساتھ گاتے ہیں:

لوری لال نوں دیواں نکے بال نوں دیواں
لال وے لے لے لوری .... !

انہی میلوں میں ایک میلہ چھڑیوں کا میلہ ہے۔ کسی زمانے میں یہ بہت مشہور میلہ تھا اور گرمیوں میں مستی دروازے کے باہر مغلوں کے بنائے ہوئے قدیم باغ میں بڑے بڑے تناور درختوں کے پاس لگتا تھا۔ ویسے یہ میلہ ایک بزرگ شاہ مدار کی یاد میں ملک بھر میں منایا جاتا ہے۔ اس میں چھڑیوں کے کمالات کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ لمبے لمبے بانسوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے کس کر باندھ دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی بلندی سہ منزلہ عمارت تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر بازی گر کبھی ناک پر کبھی آنکھ پر اور کبھی ٹھوڑی پر اسے سنبھالتے ہیں اور اتنی خوبی سے توازن برقرار رکھتے ہیں کہ چھڑیاں گرنے نہیں پاتیں۔ چھڑیوں کے ساتھ رنگ برنگے کپڑے بندھے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ساتھ ساتھ دف بجا کر گاتے بھی رہتے ہیں۔ اب یہ فن بالکل مٹ چکا ہے اور یہ میلہ ماضی کے پردوں میں گم گیا ہے۔ اس میں کبھی کبھار لاہوریوں کی آپس میں لڑائی بھی ہو جاتی تھی اور چاقو وغیرہ عام چلتے تھے۔

پار کا میلہ بھی یہاں کے میلوں میں شامل ہے۔ یہ دریا پار جہانگیر کے مقبرے پر لگتا ہے، اس لیے پار کا میلہ کہلاتا ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے شالامار کے میلے کی طرح بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا

تھا۔ بعد میں لوگوں نے ایک چیز کا اضافہ کر دیا وہ یہ کہ لاہور کے زندہ دل آس پاس کوٹھے کرائے پر لے لیتے اور رات رات بھر مجروں سے لطف اندوز ہوتے۔ اب یہ میلہ برائے نام ہی رہ گیا ہے۔

لاہور کے میلوں میں عرس داتا گنج بخشؒ ایک خاص عقیدت مندانہ انداز میں منایا جاتا ہے۔ یہ حضرت علی ہجویریؒ کے مزار پر 20 صفر کو لگتا ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ سلطان محمود کے بیٹے مسعود کے زمانے میں غزنی سے تشریف لائے اور چونتیس سال یہاں رشد و ہدایت کے دریا بہاتے رہے۔ آپ کے عرس کے موقع پر ایک عالیشان میلہ لگتا ہے جو تین دن تک جاری رہتا ہے۔ مہینوں پہلے سے اس کی تیاری شروع ہو جاتی ہیں۔ دور دراز سے لوگ آتے ہیں اور بھاٹی سے ٹکسالی تک تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی۔

اس میلے میں دور دور سے زائرین آتے ہیں۔ رات بھر مزار کے اندر مسجد کے صحن اور ملحقہ دالان میں درود و سلام کی ایمان پرور آواز گونجتی رہتی ہے۔ پورے مزار کو برقی قمقموں سے سجایا جاتا ہے۔ دو رات اور ایک دن محفل سماع برپا رہتی ہے۔ قوال صوفیاء کا کلام گاتے ہیں۔ منظر انتہائی دیدنی ہوتا ہے۔ سارے کے سارے ماحول پر ایک وجدانی کیفیت طاری رہتی ہے۔ ہر سمت سے ہوحق کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ درویش اور ملنگ ڈھول کی تھاپ کے ساتھ دھمال ناچتے ہیں۔ اس میلے کی سب سے بڑی سوغات تیل کے قتلمے اور مٹی کے برتن ہیں۔

اس عرس کے کچھ عرصہ بعد میاں میرؒ صاحب کا میلہ بھی عرس کے موقع پر ہی لگتا ہے۔ حضرت میاں میر صاحب سویستان (سہون) میں پیدا ہوئے اور اٹھاسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ آپ کا سلسلہ نسبت فاروق اعظمؓ سے ملتا ہے۔ آپ زہد و تقویٰ میں یکتا تھے۔ ہزار ہا لوگوں نے آپ سے کسب فیض کیا۔ آپ کے معتقدین میں بڑے بڑے بادشاہ اور امراء گزرے ہیں۔ دارا شکوہ آپ کا بہت بڑا معتقد تھا، اس نے اپنی کتاب میں جابجا ذکر کیا ہے کہ آپ لاہور کے کن کن باغوں میں سیر کیا کرتے تھے اور عبادت کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ جب یہ میلہ لگتا ہے تو لاہور سے میاں میر تک ٹانگوں، سائیکلوں، موٹروں الغرض ہر طرح کی سواری کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یہ میلہ دو دن جاری رہتا ہے۔

بھدر کالی کا میلہ پہلے بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا تھا۔ لاہور کے نزدیک نیاز بیگ میں ہندوؤں کی مشہور دیوی بھدر کالی کا استھان ہے۔ یہ میلہ جون میں اسی استھان پر لگتا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے ہندو اور مسلمان سب ہی اس میلے میں شامل ہو جاتے تھے۔ اس استھان میں ایک بڑا تالاب اور ایک گھنا باغ ہے۔ ایسی جگہ جون کی شدید گرمی میں غنیمت سمجھی جاتی ہے۔ لوگ تالاب میں اشنان کرتے

تھے اور درختوں کے سائے تلے باغ میں آرام کرتے تھے۔ اب یہ میلہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔

بیساکھی کا میلہ ایک منفرد اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ماہ بیساکھ کی یکم تاریخ کو لگتا ہے۔ پہلے اس میں ہزاروں ہندو سکھ مرد و زن سبھی شامل ہوتے تھے۔ یہ راوی کے کنارے ہوتا تھا جہاں لوگ اشنان کرتے تھے۔ دیہاتی ڈھول کی لے پر پیروں میں گھنگرو باندھ کر ناچتے تھے اور بھنگڑا ڈالتے تھے۔ تقسیم کے بعد اس کا زور کم ہو گیا ہے۔

جوڑ کا میلہ قلعے کے سامنے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ پر گوروارجن دیو کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ دور دور سے سکھ یاتری آتے ہیں پہلے ہندو بھی شامل ہوتے تھے۔ یہ میلہ لگتا تھا تو چوک ہیرا منڈی سے لے کر گوردوارہ تک دو رویہ دکانیں ہی دکانیں ہوتی تھیں۔ ٹھنڈے پانی اور لسی کی سبیلیں لگتی تھیں۔ ملک کے مشہور راگی میلے کے موقع پر یہاں کیرتین گاتے تھے اور زائرین چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ اب بھی سکھ باہر سے اس میلے کے موقع پر آتے ہیں۔

پتنگ بازوں کا میلہ لاہور کے رہنے والوں کی فطری آزادی، اسلوب زندگی اور روایات کی عکاسی کرتا ہے۔ شاہی محلے میں جہاں اب مکانات اور ڈینٹل ہسپتال بن گئے ہیں، کسی زمانے میں یہاں کھلا میدان تھا جس میں پرانے وقتوں سے ہی برگد کے بڑے پرانے اور تناور درخت تھے۔ یہاں لاہور کے پتنگ باز اکٹھے ہو کر پتنگوں کے پیچ لڑاتے تھے جنہیں وہ اپنی زبان میں اب بھی ضدیں کہتے ہیں۔ بعد میں آبادی ہو گئی اور یہ ضدیں منٹو پارک میں ہونے لگیں۔ سینکڑوں بچے بوڑھے اور جوان اس میں حصہ لیتے ہیں۔

O

2000ء میں لاہور کیسا ہوگا؟ 1970ء کے اندازے

زندہ دلوں کا شہر، باغوں کا شہر، مسجدوں اور مزاروں کا شہر، لاہور کب تعمیر ہوا؟ اس سوال کا جواب چند تاریخ دان اور ماہرین آثار قدیمہ کے نزدیک یہ ہے کہ لاہور رام چندر جی کے بیٹے لو نے بسایا تھا لیکن اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے کوئی ثبوت موجود نہیں۔ لاہور کی قدیم ترین عمارت مسلمانوں کے زمانے کی ہے اور شہر لاہور کا ذکر پہلے پہل سلطان محمود غزنوی کے عہد میں ملتا ہے لیکن لاہور کی بنیاد کے سلسلے میں لاہوریت کی بنیاد بھی خاصی اہم ہے۔ لاہور اگر زمین کے ٹکڑے اور اینٹ گارے کی عمارتوں کا نام ہے تو شاید ان میں کوئی خاص دلکشی ہے۔ لاہور کا ایک مطلب تو وہ شہر ہے، جو دریائے راوی کے کنارے سطح سمندر سے سات سو فٹ اوپر پنجاب کے زرخیز میدانوں کے درمیان واقع ہے۔ لیکن لاہور کا ایک مطلب اور بھی ہے، یعنی وہ تاثر یا جذبہ جو پردیس میں کسی لاہوری پر لاہور کا نام سنتے ہی طاری ہو جاتا ہے۔ وہ آواز ہے جو صبح صبح آپ کو جگاتی ہے یا پھر وہ لذت ہے جسے حاصل کرنے کے لیے قدم غیر ارادی طور پر لاہور کے کسی چوک کی مشہور زمانہ کھانے کی جگہ کے لیے اٹھ جاتے ہیں۔ لاہور ایک شہر ہی نہیں ایک ماحول ہے۔ ایک ثقافتی اور تہذیبی تحریک ہے جس کا مرکز یہی ہمارا لاہور اس کی گلیاں، بازار، عمارات اور باغات ہیں۔

لاہور میں وقت کے ساتھ ساتھ بڑی تبدیلیاں اور اضافے ہوئے ہیں۔ یہ ایک قصبے سے شہر اور شہر سے عظیم ترین شہر بن رہا ہے (1970ء)۔ لاہور کے اس پھیلاؤ اور وسعت کو شہر کے مزاج اور ماحول کے مطابق ہونا چاہیے لیکن حقیقت برعکس ہے۔ شہر کسی ضابطے یا منصوبے کے تحت نہیں پھیلا اور شہر کی وسعت کے ساتھ ساتھ شہر والوں کی مشکلات میں اضافہ ہوا ہے۔ لاہور کا وسطی علاقہ قرون وسطیٰ سے آباد پرانے شہر پر مشتمل ہے۔ اردگرد کی آبادیاں بھی نئے نئے اصولوں اور منصوبہ بندی کی بجائے اس دور کی معاشی و عمرانی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے آباد ہوتی گئیں۔ لاہور کی قدیم آبادی کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ لاہور کی ابتدا بھی گاؤں کی طرح ہوئی ہوگی۔ لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید کے

مطابق یہ ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے زمانہ میں بھی اسی مقام پر واقع تھا اور اس کی مزید آبادکاری ہو رہی تھی۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر لکھتے ہیں کہ لاہور کا ذکر سب سے پہلے حدود العالم نامی کتاب میں ملتا ہے۔ بہرحال لاہور سلطان محمود غزنوی کے عہد تک زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ملک ایاز نے لاہور میں سلطان کے نائب کی حیثیت سے حکومت کی اور شہر میں اسلامی طرز کی عمارات تعمیر ہوئیں۔ خاندان سادات کے سلطان سید مبارک شاہ نے 1421ء میں لاہور کی از سر نو تعمیر کا حکم دیا۔ رفتہ رفتہ شہر ایک اہم فوجی تجارتی اور علمی مرکز بن گیا۔ پنجاب کی زرعی پیداوار، دستکاری اور علوم وفنون کے لئے لاہور کو صدر مقام کی حیثیت حاصل تھی۔ مغل بادشاہ اکبر کے دور میں شہر کے گرد پختہ دیوار تعمیر کرائی گئی۔ لاہور کا قلعہ بھی اکبر نے از سر نو تعمیر کرایا اور خیر پورہ اور دھرم پورہ نام کے دو غریب خانے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے آباد کرائے۔

شہر پناہ کے اندر

لاہور کو اس زمانے میں چھتیس (36) حلقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ ہر حلقہ گذر کہلاتا تھا اور کئی محلوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ نو گذر شہر پناہ کے اندر واقع تھے اور باقی اس سے باہر آباد تھے۔ لاہور قدیم کے مصنف مفتی تاج الدین نے ان کی تفصیل اس طرح دی ہے:

اندرون شہر

1- گذر چھجہ دیوانی (نزد موچی دروازہ)
2- گذر مچھی ہٹہ (شاہ عالم دروازہ سے رنگ محل تک)
3- گذر وچھووالی (وسط شہر)
4- گذر مبارز خان (لاہوری منڈی)
5- گذر رڑہ (بھاٹی دروازہ تا بازار ٹبی)
6- گذر اڈہ (اندرون یکی دروازہ دہلی دروازہ اکبری دروازہ)
7- گذر شیخ محمد اسحاق (اندرون شیرانوالہ دروازہ)
8- گذر شہباز خاں (شاہی قلعہ کی جنوبی دیوار کے زیر سایہ آبادی)
9- گذر مانک چوک (سید مٹھا سے ٹکسالی دروازہ تک)

بیرون شہر

فیصل شہر سے باہر ستائیس گذر تھے۔ان کے نام نہیں مل سکے،البتہ درج ذیل محلے اس زمانے میں خوب آباد تھے: محلّہ حاجی سوائے (بیرون موچی دروازہ)، محلّہ طلاء بخاری (بیرون شاہ عالمی دروازہ)، محلّہ پیر عزیز مہز نگ (مزنگ)، محلّہ ابو اسحاق (مزنگ)، محلّہ کوٹ کروڑی (نزد قلعہ گوجر سنگھ)، محلّہ پیر دلاوری (مزنگ)، محلّہ قطب غوری (انارکلی مقبرہ قطب الدین ایبک کے پاس)، محلّہ رسول پور (مزنگ)، محلّہ لکھی (نزد نئی انارکلی)، چوک دارا (بیرون موچی دروازہ)، محلّہ جوہریاں (بیرون موچی دروازہ)، محلّہ شاہ کاکو (نزد مسجد شہید گنج)، نخاس، محلّہ حاجی نالہ (بیرونی دہلی دروازہ)، محلّہ سید سر (گڑھی شاہو)، محلّہ کھوئی میراں (چاہ میراں)، منڈی شہزادہ پرویز (چاہ میراں)، چوہٹہ سوداں (نزد چاہ میراں)، دروازہ مندر (بدھو کا آوا)، بیگم پورہ (نزد باغبانپورہ)، کوچہ تیلیاں (باغبانپورہ)، محل مشکی (بیگم پورہ اور شالا مار باغ کے درمیان)، محلّہ خوجاں (مزنگ)، باغ نخلی (عجائب گھر پنجاب پبلک لائبریری، نیشنل کالج آف آرٹس سے چوبرجی تک)، محلّہ تیلی وہڑہ (نزد باغبانپورہ)، محلّہ بڑھی پھلواری (نزد باغبانپورہ)، محلّہ گنج (میاں میر)، ٹھٹھی ابوالخیر (گڑھی شاہو)، بستی میاں میر (میاں میر)، محلّہ دولت آباد (مزنگ)، محلّہ پیر بھاون (امام باڑہ کربلا گامے شاہ)، شیش محل (نزد داتا دربار)، محلّہ تل بھوگا (داتا دربار)، محلّہ شیخ اشرف (بھاٹی دروازہ سے ضلع کچہری تک)، بند عالمگیری (مستی دروازے سے محمود بوٹی تک)، محلّہ فدائی خاں (بیرون اکبری دروازہ)، محلّہ پنڈ ڈھولاں (مزنگ)، محلّہ میانی (مزنگ)، اور کنبوواڑہ۔ان محلوں کے علاوہ مغل آبادیوں کے آثار شالا مار باغ سے موضع نیاز بیگ تک ملتے ہیں۔اچھرہ اس زمانے میں لاہور کا ایک ذیلی قصبہ یا گاؤں تھا۔ان محلوں میں اکثر کے گرد حفاظتی دیوار موجود تھی۔باغ دلکشا (شاہدرہ)، مغل دور کی ہر دل عزیز سیر گاہ تھی لیکن دریائے راوی کی گزرگاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں قلعہ کی شمالی دیوار سے موجودہ گزرگاہ کی جانب تبدیل ہوتی گئی اور اس طرح باغ دلکشا کا ایک بڑا حصہ دریا برد ہو گیا۔لاہور اس زمانے میں باغوں اور نہروں کا ایک ہرا بھرا شہر تھا۔منشی محمد دین فوق نے ایک یورپی سیاح کا بیان نقل کیا ہے، وہ لکھتا ہے:

''آگرہ سے روانہ ہوتے ہوئے ہمیں اکیسواں دن تھا کہ مغلیہ سلطنت کا مشہور شہر لاہور نظر آیا جس کی آبادی اس قدر تھی کہ شہر کے باہر ڈیڑھ میل تک خوش نما خیموں اور نفیس عمارتوں میں پھیلی ہوئی

تھی۔اس خوبصورت شہر کے بڑے بڑے دروازے ہیں اور ہر دروازے پر مختلف رنگوں کے گنبد ہیں۔شہر میں داخل ہونا معمولی بات نہ تھی۔ کچھ لوگ پیادہ چل رہے تھے، کچھ اونٹوں پر تھے اور کچھ ہاتھیوں پر تھے۔ چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بھی بکثرت تھیں۔غرض کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ بازاروں کی صفائی اور پاکیزگی دیکھ کر ہم بے حد متاثر ہوئے ہیں۔سکون واطمینان اور امن وامان ہر شخص بلکہ ہر درو دیوار سے ظاہر ہو رہا ہے۔اس کے بڑے بازار کا نام بازار دلکشا ہے۔ یہاں اس قدر دولت ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ یورپین منڈی کا مقابلہ کرسکتا ہے۔'' یہ سیاح شاہ جہاں کے دور میں آیا تھا۔لاہور اس زمانہ میں اپنے عروج پر تھا۔ چنیوٹ سے تعلق رکھنے والے شاہجہانی امیر وزیر خاں نے اس شہر کی ترقی میں خصوصی دلچسپی لی۔دیگر مغل امراء مثلاً علی مردان خاں اور آصف خاں نے بھی لاہور کی خوبصورتی میں اضافے کیے۔مغلوں کے زوال کے ساتھ ہی شہر کی شکست وریخت کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔

احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے قدیم شہر کو تباہ کر دیا اور اس کا بڑا حصہ کھنڈروں میں تبدیل ہو گیا۔سکھوں کے عہد حکومت میں ان کھنڈروں اور مزارات سے اینٹ پتھر حاصل کیا گیا اور نئی تعمیرات کی گئیں۔لاہور گوجرسنگھ، لہناسنگھ اور سوبھاسنگھ کے درمیان تقسیم ہوگیا۔رنجیت سنگھ نے اسے پایہ تخت قرار دیا اور نئی عمارات تعمیر کرائیں۔1849ء میں انگریزوں نے سکھوں کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کرلیا۔اس وقت لاہور قدیم شہر اور ذیلی آبادیوں پر مشتمل تھا۔شہر کے اندر بازار اور گلیاں بہت تنگ تھے۔فصیل کے چاروں طرف گہری خندق بھی موجود تھی اور میلوں تک مغلیہ دور کی عمارات کے کھنڈر زبان حال سے اپنی گزشتہ عظمت وشوکت کی داستان سنا رہے تھے۔1885ء تک ان عمارات کی اینٹیں انگریزی دور کی سرکاری اور عمومی عمارات میں استعمال ہوتی رہیں۔

آبادی کا پھیلاؤ

لاہور میں آبادی پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران بڑی سرعت سے بڑھی۔شہر کی ترقی کسی اصول کے تحت نہیں ہوئی، چنانچہ بعض ایسے علاقے آباد ہو گئے جن کی سطح بلند نہیں اور بارش کے وقت وہاں پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔انگریزوں نے شہر میں اضافہ اپنی ضروریات اور خواہشات کے مطابق کیا۔ پہلے قلعہ کو رہائشی چھاؤنی کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔پھر نئی انارکلی اور پیسہ اخبار کے علاقے بھی انگریزی آبادی بن گئے۔اس کے بعد سول لائن کا علاقہ معرض وجود میں آیا۔شاہراہ قائداعظم (مال روڈ)

کی موجودہ صورت کئی تبدیلیوں کے بعد 1920ء کی دہائی تک بنی۔ ریلوے اسٹیشن، ریلوے کالونی، جی او آر، لاہور چھاؤنی (میاں میر) اور دیگر رہائشی علاقے بتدریج بڑھتے چلے گئے۔ انگریزی حکومت کے آخری دور میں لاہور کے ہندو شہریوں نے کرشن نگر اور ماڈل ٹاؤن کی رہائشی کالونیاں آباد کیں۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور کی حیثیت پاکستان کے وسطی و شمالی علاقے کے مرکز کی ہوگئی۔ تجارت اور کاروبار کے مواقع تعلیمی و صنعتی ترقی کی وجہ سے متحدہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کی بڑی تعداد یہاں آباد ہوگئی۔ پنجاب کی زرعی پیداوار کی منڈی اور تعلیم و صنعت تجارت اور کاروبار کے مرکز کی حیثیت سے لاہور کی آبادی سرعت سے بڑھ رہی ہے۔ اردگرد شہروں اور دیہات کے لوگ بڑی تعداد میں یہاں آ کر آباد ہو رہے ہیں۔ آبادی میں اس مسلسل اضافے سے رہائشی سہولتوں کا فقدان ہے۔ شہر میں کئی دیگر مسائل کو حل کرنے کے لئے پہلے لاہور کارپوریشن اور پھر لاہور امپروومنٹ ٹرسٹ نے اقدامات کئے۔ (1970ء) وحدت مغربی پاکستان کے قیام سے لاہور کو سرکاری طور پر زیادہ اہمیت حاصل ہوئی اور آبادی میں مزید اضافہ ہوا۔ ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے سمن آباد، شاد باغ اور گلبرگ کے منصوبے بنے۔ نئے سرکاری ملازمین کے لئے وحدت کالونی، بہاولپور ہاؤس، پونچھ ہاؤس اور چوبرجی کوارٹرز بنائے گئے۔ لیکن یہ لاہور کی رہائشی سہولتوں میں خاص اضافے کا موجب نہ بن سکے۔ سمن آباد، شاد باغ، گلبرگ کی جدید طرز کی آبادیاں اونچے اور درمیانہ درجے کے آمدنی رکھنے والوں کی ضروریات پورا کرتی ہیں اور یہ بذات خود ایک مسئلہ بن گئی ہیں۔ ان آبادیوں کے مکین گوناگوں پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ زمین کی قیمت اور شہر سے فاصلے میں نسبت نہیں۔ ذرائع آمدورفت اور ضروریات کی بہم رسانی صحیح انداز سے ترتیب نہیں دی گئیں اور اکثر و بیشتر آبادیاں شہر کے وسطی علاقوں میں دستیاب سہولیات پر انحصار کرتی ہیں۔ اس وجہ سے سڑکوں پر ہجوم اور وقت کا ضیاع ہے۔ دوسری طرف شہر سے مناسب فاصلے پر واقع زمین غیر ضروری مصرف میں ہے اور اس طرح شہر کے صحت مند پھیلاؤ اور ترقی میں نئی عمارات رکاوٹ ثابت ہو رہی ہیں۔

عظیم تر لاہور

لاہور کے شمال میں دریائے راوی کی قدرتی رکاوٹ کے طور پر موجود ہے۔ دریا پر نئے اور کشادہ پل کی تعمیر کی باوجود شہر کی آئندہ وسعت کا رخ ادھر نہیں ہوسکتا کیوں کہ شاہدرہ کی بڑھتی ہوئی آبادی اور لاہور کی آبادی کے درمیان دریا کی وسیع گزرگاہ، حفاظتی بند اور مقبرہ جہانگیر، باغ دلکشا کا قومی

محفوظ پارک واقع ہے۔ شاہدرہ سے آگے گوجرانوالہ روڈ، شیخوپورہ روڈ اور نارووال ریلوے لائن پر واقع کارخانوں کی قطار شمالی اور شمالی مغربی جانب آگے بڑھ رہی ہے۔ (1970ء) اس جانب رہائشی، تعلیمی، تفریحی اور تجارتی لحاظ سے شہر لاہور سے بالکل مختلف قسم کی آبادی معرض وجود میں آ رہی ہے جو نیم خود کفیل ہے۔ لاہور کے مشرق میں تاریخی شاہراہ اعظم یعنی امرتسر روڈ پاکستان بننے سے پہلے شہر کے پھیلاؤ کا ایک سب سے اہم راستہ تھا لیکن اب پاکستان بھارت سرحد نزدیک ہونے اور جنگ ستمبر 1965ء کے واقعات کے پیش نظر آبادی کا پھیلاؤ اس جانب زیادہ نہیں ہوا۔ شالامار باغ سے آگے رہائشی صنعتی علاقے بننے کی بہت کم امید ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ لاہور کے بڑھنے کے لئے شمالی اور مشرقی اطراف موزوں نہیں۔ لاہور کے مغرب میں ملتان روڈ کے ساتھ ساتھ رہائشی منصوبوں اور صنعتی علاقوں کا ایک سلسلہ وجود میں آ رہا ہے اور اس طرف مزید وسعت کی گنجائش ہے۔

فیروز پور روڈ جو لاہور کے جنوب میں واقع ہے، لاہور کو قصور سے ملاتی ہے۔ اس راہداری (کوریڈور) کے دونوں طرف بڑی تیزی سے آبادی ہو رہی ہے۔ منصوبہ عظیم تر لاہور میں ملتان روڈ اور فیروز پور روڈ کے درمیانی علاقے کو ترقی دینے کی سفارش کی گئی ہے اس سڑک سے ملحق گارڈن ٹاؤن، لاہور اسٹیڈیم، ماڈل ٹاؤن، والٹن، نیو یونیورسٹی ٹاؤن، کوٹ لکھپت انڈسٹریل ایریا، لاہور جنرل ہسپتال اور لاہور ٹاؤن شپ کے منصوبے اور علاقے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی جانب آبادی اور ٹریفک کا دباؤ بھی بڑھ گیا ہے۔ لاہور کی موجودہ حالت اور ترقی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ کچھ عرصہ بعد لاہور کی شہری منصوبہ بندی کے لئے نہایت سنجیدہ مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ ان کا از وقت حل تلاش کرنا ضروری ہے کیوں کہ لاہور کے ماحول اس کے رنگ و روپ اور اس کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے لاہور کے شہریوں کی مشکلات میں اضافے کو روکنا بھی جدید شہر کے تقاضوں میں شامل ہے۔

پھیلاؤ کی دو صورتیں

اس وقت لاہور کے پھیلاؤ کے دو صورتیں ہیں:

1- موجودہ تعمیر شدہ علاقے کو زیادہ گنجائش دینا اور زیادہ فائدہ مند بنانا۔

2- لاہور کے قدرتی پھیلاؤ کے راستے یعنی ملتان روڈ اور فیروز پور روڈ کے درمیانی علاقے میں نئی منصوبہ بندی۔

لاہور میں اس وقت جو علاقہ شہری ضرورتوں کے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے (1970ء)۔

رہائشی مقاصد کے لئے: 42.8 فی صد، صنعتی مقاصد کے لئے: 10.3 فی صد، تجارتی اور کاروباری مقاصد کے لئے: 1.5 فی صد، عوامی عمارتوں کے لئے: 8.7 فی صد، باغات و پارک کے لئے: 4.6 فی صد، قبرستان کے لئے: 1.6 فی صد، ذرائع آمدورفت ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ وغیرہ: 14.9 فی صد، سڑکیں اورگلیاں: 11.9 فی صد۔

اس گوشوارے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک سب سے زیادہ زمین رہائشی مقاصد کے لئے استعمال ہوئی ہے (42.8 فی صد)۔ اس کی ایک وجہ تو لاہور میں ایک منزلہ مکانات کی فراوانی ہے اور دوسری لاہور امپروومنٹ ٹرسٹ کی سکیموں کے مکانات ہیں جو وسیع قطعات پر تعمیر کیے گئے ہیں۔ ذرائع آمدورفت میں 14.9 فی صد بظاہر زیادہ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ زیادہ تر ہوائی اڈہ کے وسیع علاقے کو شامل کرنے سے ہے۔ ان اعداد و شمار میں معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میں مختلف النوع استعمال شدہ علاقوں کے رقبے میں کوئی متوازن نسبت نہیں ہے اور اس میں اصلاح کی گنجائش ہے۔ لاہور کے موجودہ ڈھانچے میں آبادکاری کے لئے کچھ علاقہ باقی ہے جو چھوٹے چھوٹے منصوبوں مثلاً تعلیمی اداروں، مکانات اور دکانوں کا متحمل ہوسکتا ہے۔ ان میں سمن آباد اور اچھرہ کا درمیانی علاقہ، لاہور چھاؤنی میں کچھ علاقہ، ماڈل ٹاؤن کے آس پاس کا علاقہ شامل ہے۔ شہر کے چند علاقوں مثلاً میکلوڈ روڈ اور میو ہسپتال کے درمیان بینک سکوائر اور ریلوے اسٹیشن کے بلمقابل علاقے میں جدید طرز پر کاروباری اور دفتری عمارات بننی شروع ہوگئی ہیں اور اس طرح زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعات سے زیادہ فائدہ اور جگہ حاصل کی جارہی ہے۔ (1970ء) لاہور کی وسعت میں ان تبدیلیوں اور نئی عمارتوں کا براہ راست اثر پڑے گا اور لاہور کی مرکزیت اسی پرانے علاقے میں رہے گی۔ لاہور کے جدید دور کے لیے نئی زمینوں کے استعمال کی صورت میں پھیلاؤ کے لئے دوراستے ہیں:

1- مغرب اور جنوب میں بین الاضلاعی شاہراہوں کے ساتھ ساتھ اور ان کے درمیان کارخانوں اور رہائشی علاقوں کی تعمیر۔

2- دریائے راوی کے پار گوجرانوالہ، شیخوپورہ اور لائل پور (1970ء) کی جانب نئی تعمیرات خصوصاً صنعتی علاقے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شہری ترقی کا یہ رجحان قابل تشویش ہے۔ لاہور

کے شمال میں ضلع شیخوپورہ اور ضلع گوجرانولہ بے مثال زرعی علاقے ہیں جو بین الاقوامی معیار کے چاول اور دوسری زرمبادلہ کمانے والی اجناس پیدا کرتے ہیں۔ آبپاشی کا نظام زرعی ضروریات کے لئے کافی ہے۔ سیم اور تھور پر قابو پانے کے لئے حکومت نے کئی سالوں تک ترقیاتی بجٹ کا ایک بڑا حصہ ٹیوب ویلوں کی تنصیب پر خرچ کیا ہے۔ مزید براں یہ علاقہ دفاعی طور پر اس کا متحمل نہیں کہ یہاں قومی معیشت میں اہمیت رکھنے والے کارخانے اور دیگر مشینری نصب کی جائے۔ لاہور سے راولپنڈی پشاور جانے والے مصروف ترین راستے پر ان علاقوں کی موجودگی لاہور کے قریب آمدورفت کا ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ زمین کی قیمت بھی نسبتاً زیادہ ہے۔ متعدد برساتی نالوں اور دریائے راوی کے سیلابی پانی سے بچاؤ کے لیے مزید سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔

دوسری جانب ملتان روڈ اور فیروز پور روڈ دفاعی لحاظ سے محفوظ تر علاقہ ہے۔ زمین کی قیمت دیگر اطراف کے مقابلے میں کم ہے اور زرعی پیداوار بھی نسبتاً کم ہے۔ فیروز پور روڈ میں لاہور کی آئندہ آبادی کو سنبھالنے کی صلاحیت ہے لیکن دفاعی نقطہ نظر سے اس کے مشرقی علاقے کی افادیت کم ہو جاتی ہے۔ فیروز پور روڈ فی الحال لاہور کو قصور اور گنڈا سنگھ والا کے راستے بھارت سے ملانے والی بین الاقوامی شاہراہ کا کام دے رہی ہے۔ (1970ء) اس پر خوبصورت علاقوں کی تعمیر قومی وقار کے لئے لازمی ہے۔ یہ لاہور میں مستقبل کا سب سے خوبصورت علاقہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ملتان روڈ پر سمن آباد اور فلم سٹوڈیوز کے بعد صنعتی اور رہائشی علاقوں میں اضافے کی رفتار ابھی سست ہے۔ لیکن مستقبل قریب میں وہاں صنعتی علاقوں میں اضافے کے امکانات ہیں۔ ایک مثلث کی صورت میں ملتان روڈ، بہاولپور روڈ اور فیروز پور روڈ میں گھرا ہوا علاقہ جنوب مغرب کی جانب پھیلتا چلا جاتا ہے اور ترقی کے زبردست امکانات رکھتا ہے۔ نہر اپر باری دوآب کے ساتھ ساتھ دورویہ سڑک سے فیروز پور روڈ اور ملتان روڈ کو آپس میں ملا دیا گیا ہے۔ اس رابطے سے اس علاقے کی ترقی پر خوشگوار اثر پڑے گا۔

جدید طریقہ تعمیر

لاہور کے آئندہ فن تعمیر کے بارے میں ابھی کوئی پیش گوئی کرنا ایک اندازے سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ 2000ء تک جس اضافے اور تبدیلی کی امید کی جا سکتی ہے اس کے لئے جدید طریقہ تعمیر اور اقتصادی لحاظ سے منعفت بخش عمارات کی ترتیب و تنظیم نہایت اہم ہے۔ لاہور زیادہ عرصے تک چھوٹے

مسجد وزیر خاں کے سامنے سامانِ خورد و نوش۔ ایڈون ویکس 1855ء

مسجد صالح کمبوہ موچی دروازہ

ایک تازہ صبح۔ایڈون ویکس 1855ء

چیئرنگ کراس (اسمبلی ہال)۔1960ء
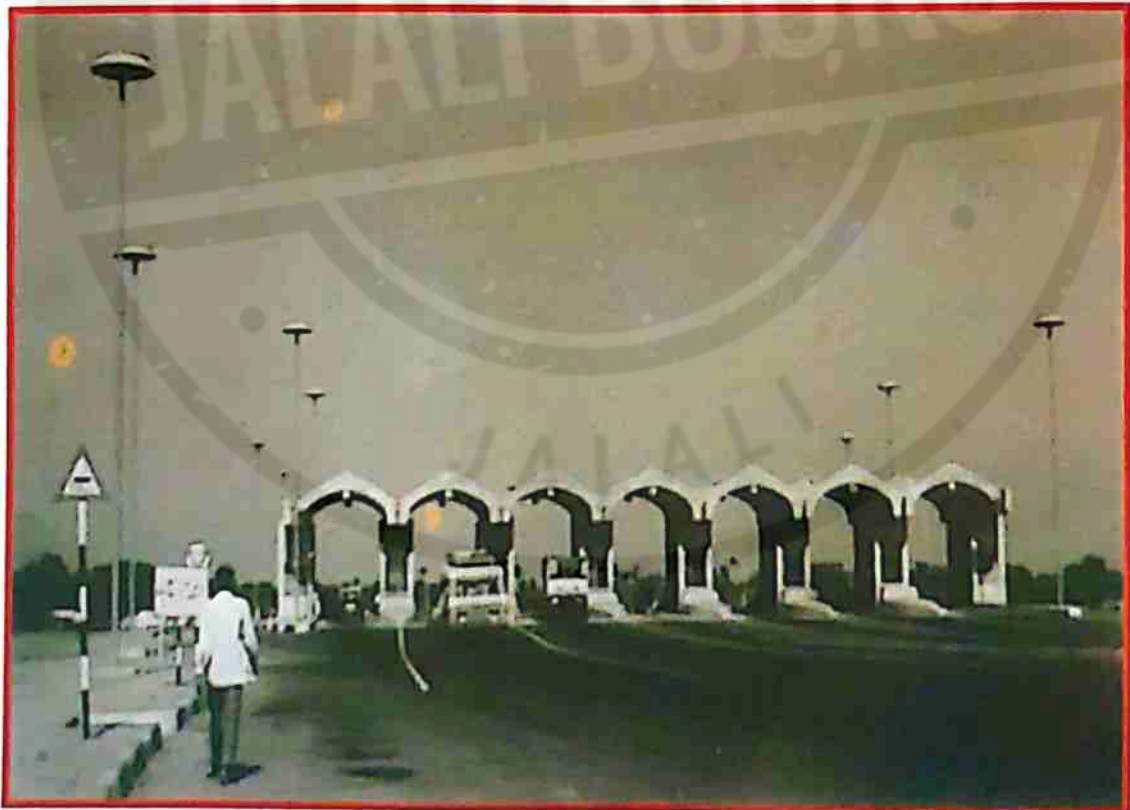
راوی کے پل پر ٹول پلازہ۔1960ء
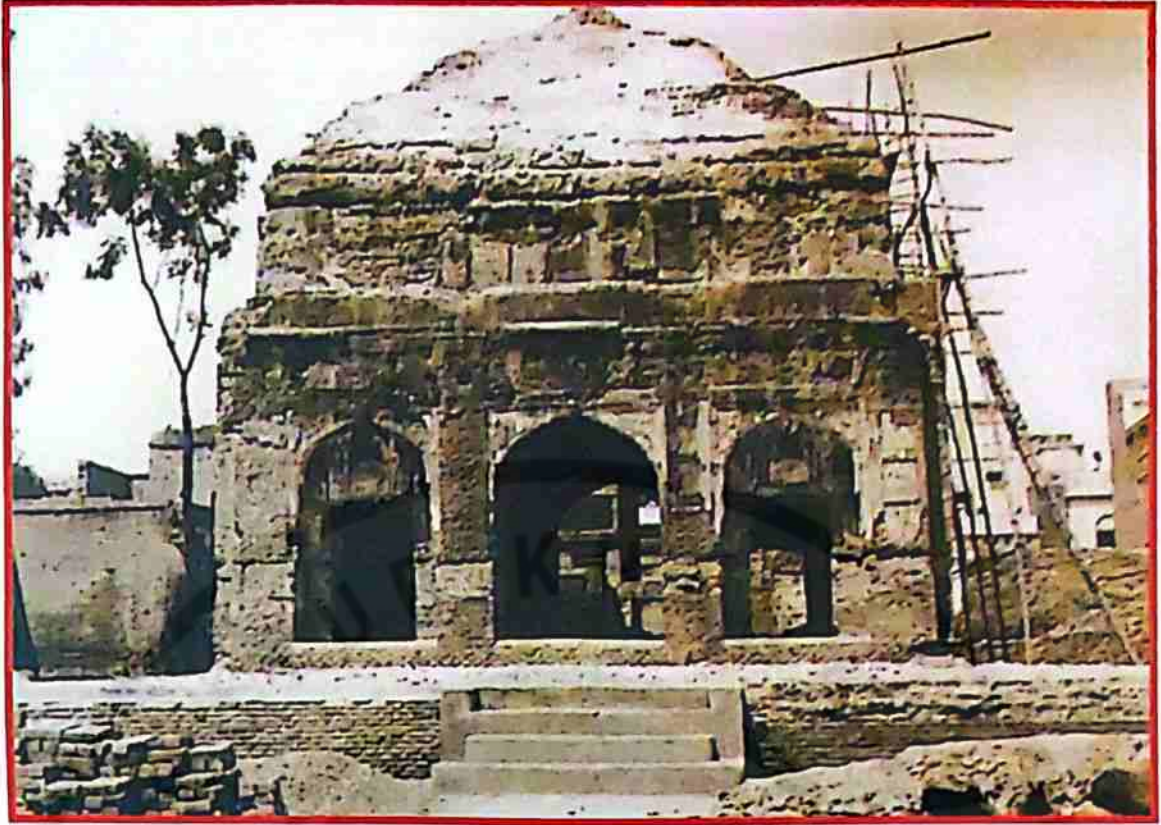
ملتان روڈ پر ایک مقبرہ جو مغل شاہزادی زیب النساء سے منسوب ہے

مغلیہ عہد کی ایک یادگار چوبرجی جو ایک شاہی باغ کا داخلی دروازہ تھا

قدیم لاہور کا ایک منظر۔ انیسویں صدی کا قلمی خاکہ

مسجد سردار خان، مزنگ میں واقع تھی
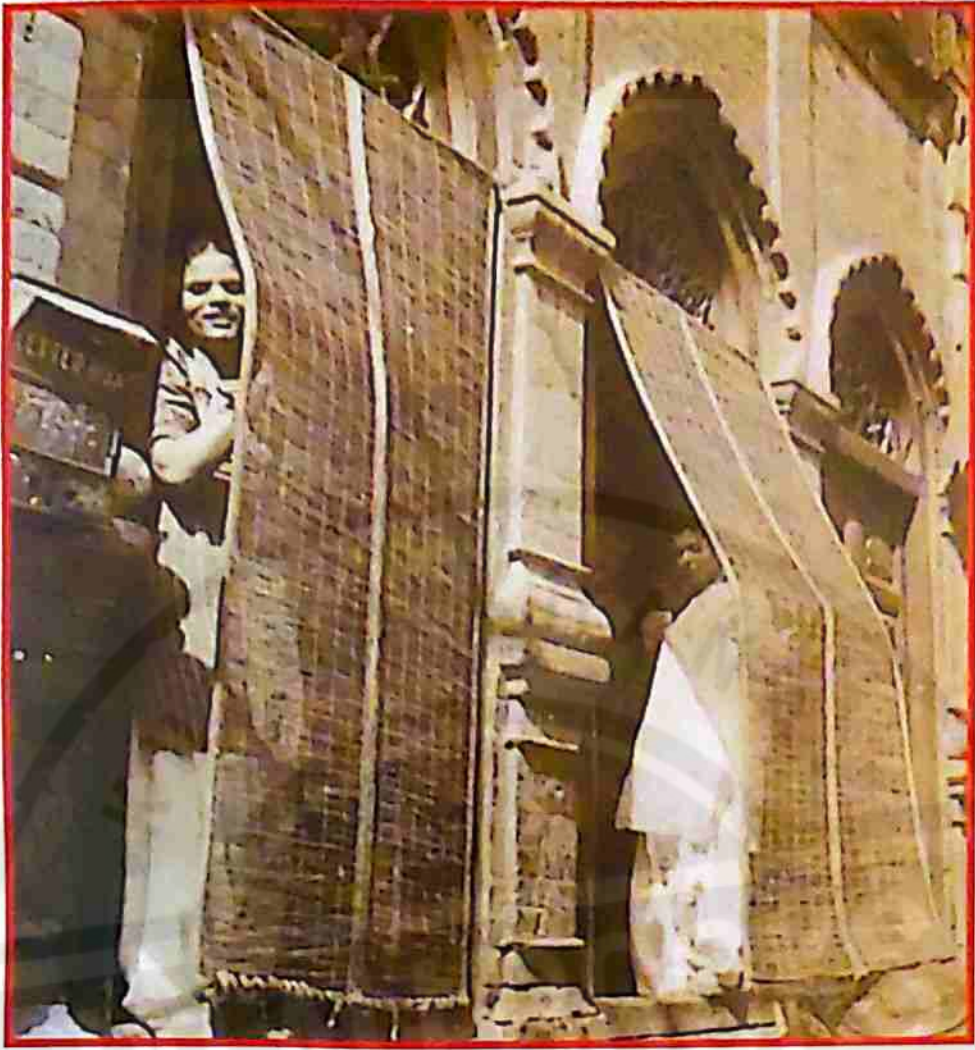
قدیم لاہور کی ایک گلی۔1985ء

فاطمہ جناح میڈیکل کالج 1960ء

پنجاب پبلک لائبریری کے قریب بارہ دری وزیر خاں اور باغِ نخلی

انار کلی چرچ جو اَب سیکریٹریٹ کا حصہ ہے، اسے انارکلی کا مقبرہ سمجھا جاتا ہے
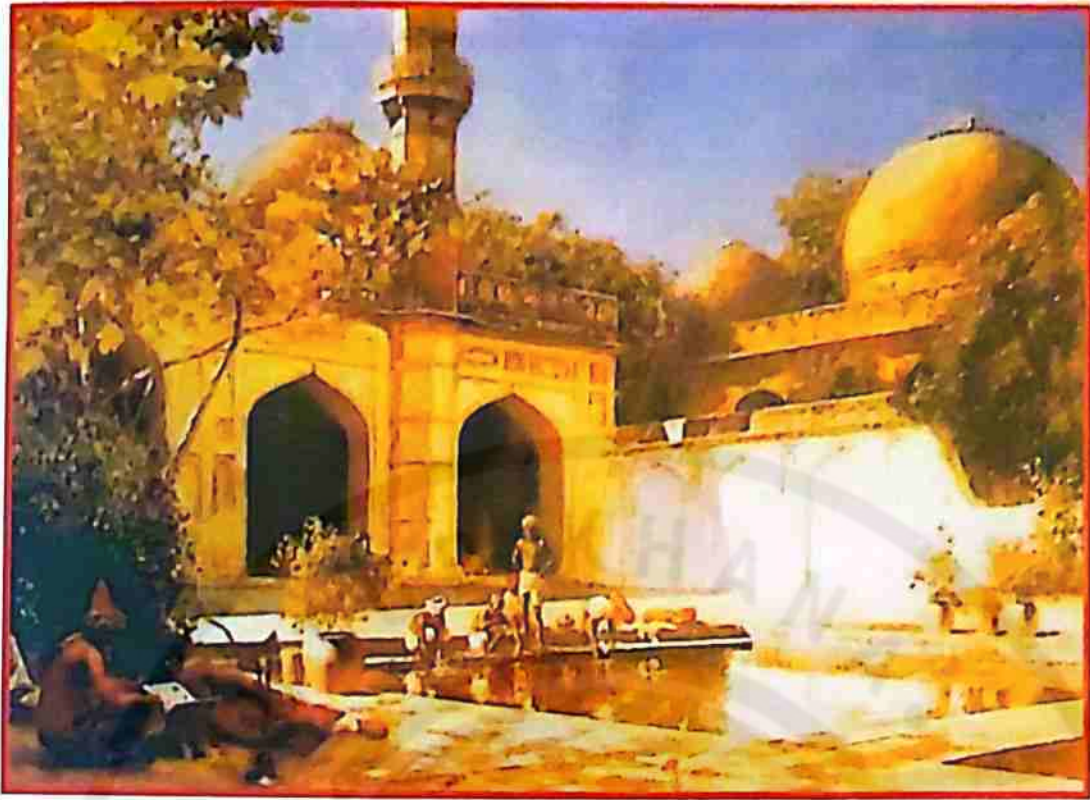
مسجد کے صحن میں ۔ ایڈون ویکس 1855ء

نقشہ لاہور ۔ 1931ء کے گزٹیئر سے لیا گیا ہے

چھوٹے تعمیری منصوبوں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ بڑے پیمانے پر ایسی نیم خود کفیل عمارتیں جن میں بنیادی ضرورت کی تمام چیزیں مثلاً رہائش، تفریح، تعلیم، خرید وفروخت اور کاروبار کا انتظام ہو، لاہور کے مستقبل کے مسائل کا ایک حل بن سکتی ہیں۔ لاہور کے تاریخی مقامات اور باغوں کو محفوظ علاقہ قرار دینے سے انہیں تفریح و تعلیمی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا اور یہ شہر کی گنجان آبادی میں کھلے علاقوں کا کردار ادا کریں گے۔ دریائے سندھ کے طاس کا کام مکمل ہونے سے اس علاقے کی ہیئت میں خاص تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔ لیکن بھارت میں دریائے راوی کا پانی پوری طرح استعمال کر لینے کے بعد دریائے راوی کی گزرگاہ اور دریا کی خشک وادی سے پیدا شدہ مسائل کی نوعیت بدل جائے گی۔ اگر اس صورت میں آبادی کا دباؤ شمالی جانب ہوا تو فن تعمیر کے جدید تجربوں کے لئے وسیع مواقع ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی، نیو کیمپس، ویسٹ ریجنل لیبارٹری اور اس سے ملحقہ علاقہ پاکستان میں تعلیم و تحقیق کا سب سے بڑا مرکز بن جائے گا۔ لاہور کا یہ حصہ فن تعمیر ماہرین کے لئے خصوصی دلچسپی کے باعث ہوگا اور لاہور کو پھر سے باغوں کا شہر بنانے کے لئے اس علاقے کی سرسبزی نہایت اہم ہے۔ لاہور کا آئندہ فن تعمیر اس شہر کی مخصوص ضروریات کے تابع ہوگا اور اس میں زیبائشی محرابوں کی بہت کم گنجائش ہے۔ لاہور کی دفاعی حیثیت کے پیش نظر مستقبل میں عمارات کی اونچائی اور پھیلاؤ بھی نہایت اہم امور ہیں۔ پرانی عمارات کی جگہ زیادہ گنجائش کی جدید عمارات بتدریج شہر کو نیا رنگ دے رہی ہے۔ 2000ء میں لاہور کی نصف کروڑ آبادی کے لئے فن تعمیر کے ماہروں کو سب سے زیادہ کام کرنا ہے۔ مختلف علوم وفنون کے ماہرین کے درمیان رابطے اور نتائج اخذ کرنے کی ذمہ داری بھی انہی کے سر ہے۔ چنانچہ مستقبل میں تعمیراتی منصوبے بہت سے ماہرین مثلاً انجینئر، معاشیات دان، ماہرین عمرانیات، شہری منصوبہ بندی اور فن تعمیر کے ماہرین کی مشترکہ کوششوں سے تکمیل پائیں گے۔

ٹریفک کا مسئلہ

لاہور کے ماحول میں سب سے بڑا مسئلہ ٹریفک کا ہے۔ لاہور میں تیز رفتار (ٹرک، بس، کار، رکشا، سکوٹر، موٹر سائیکل) اور سست رفتار (تانگہ، گڈا، جانور، سائیکل) سواریوں نے ٹریفک کی ایک عجیب وغریب صورت پیدا کی ہے۔ لاہور کے معروف ترین چوک، شاہ عالمی دروازہ، داتا دربار، ریلوے اسٹیشن، ایک موریا پل، گورنمنٹ کالج و ضلع کچہری کا چوک، لوہاری دروازہ، رنگ محل، لکشمی چوک،

چوبرجی، چیرنگ کراس، ریگل چوک، مزنگ چونگی، سیکرٹریٹ کا چوک اس مسئلے کی سب سے اہم مثالیں ہیں۔ ہر چوک کی اپنی اپنی مشکلات ہیں لیکن بعض اوقات تیز رفتار اور سست رفتار ٹریفک کے مل جانے سے سارا نظام ہی الٹ پلٹ ہو جاتا ہے۔ حادثات اور نقصانات روز بہ روز بڑھ رہے ہیں۔ شروع شروع میں راؤنڈ اباؤٹ (گول چکر) اس مشکل کا حل سمجھ لیے گئے لیکن غیر موثر ثابت ہونے پر ٹریفک سگنل لگائے گئے۔ اگر ٹریفک کے بنیادی مسائل حل نہ کیے گئے تو یہ بھی کارآمد ثابت نہیں ہوں گے۔ سب سے بڑا مسئلہ تانگوں اور سائیکلوں کا ہے۔ خصوصاً سائیکل موجودہ اور آنے والے زمانے کی مقبول ترین سواری رہے گی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں سب سے پہلے تو اس کا خرچ اور ابتدائی قیمت بہت کم ہے پھر اسے لائسنس ٹیکس یا دیگر لوازمات کی ضرورت نہیں۔ بسوں میں اضافہ کرنے سے بھی اس مسئلہ کو حل نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ روٹ کی محدود پہنچ اور کرائے سے ان کی افادیت اتنی نہیں رہی۔ لاہور میں تانگوں کی تعداد کو محدود کر دیا گیا ہے اور ان میں اضافہ کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے لیکن مستقبل قریب میں ان سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔ ان کے ختم ہونے سے جو خلا پیدا ہو گا، اسے پُر کرنے کے لئے کوئی نعم البدل فی الحال ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے مستقبل قریب میں تانگوں اور سائیکلوں کے لئے علیحدہ راستوں کا انتظام ہو جائے تاکہ وہ تیز رفتار ٹریفک کی چھیڑ چھاڑ سے محفوظ خراماں خراماں آگے بڑھتے رہیں۔ لاہور کے اکثر و بیشتر چوک موت گھر ہیں۔ کئی جگہ ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ ماہر سے ماہر ڈرائیور بھی غلطی کر سکتا ہے۔ ان چوکوں کی از سر نو ترتیب لاہور کے مستقبل میں اہم مقام رکھتی ہے۔ سڑکوں کی چوڑائی بھی اکثر ضرورت کے مطابق نہیں۔ آج سے تیس سال بعد ان پر ٹریفک کا دباؤ اور زیادہ ہو جائے گا اور ان کی چوڑائی اب سے کہیں زیادہ ہو گی (1970ء)۔ کئی جگہ دو رویہ ٹریفک دفعتاً ایک رویہ ٹریفک میں تبدیل ہو جاتی ہے جو ٹریفک کے مسئلے پیدا کرتی ہے۔ کاروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر پارکنگ کا انتظام ناکافی ہے اور یہ مسئلہ بہت جلد شہر کی اقتصادی اور ثقافتی زندگی کے لیے ایک چیلنج بن جائے گا۔ اسی طرح پانی کے نکاس اور صاف پانی کی فراہمی کے مسائل ہیں جو بڑی حد تک ناکافی ہیں۔ سب سے پہلے مختلف کام کرنے والے سرکاری و نیم سرکاری محکموں میں باہمی تعاون کا فقدان ہے۔ ٹریفک پولیس، لاہور کارپوریشن، لاہور امپروومنٹ ٹرسٹ، ہائی وے ڈیپارٹمنٹ، پی ڈبلیو ڈی، واپڈا، ٹیلی فون و ٹیلی گراف، پبلک ہیلتھ، سوئی گیس اور ہاؤسنگ ایجنسی، اپنی اپنی جگہ بااختیار ہیں لیکن بہت سے مسئلے صرف اس وجہ سے حل نہیں ہو سکتے کہ ان محکموں میں باہمی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ لاہور کے لئے ضروریات زندگی مثلاً دودھ، ڈیری

فارم اور پولٹری کی مصنوعات، سبزیاں و پھل مہیا کرنے کے لئے لاہور کے اردگرد ایک علاقہ معرض وجود میں آیا ہے جو کسی حد تک قابل عمل ہے۔ اس میں اضافے کی کوشش بہت اہم ہے۔ نیز لاہور کی آبادی میں اضافے سے مستقبل قریب میں ان ضروریات کے لیے نقل و حمل کے ذرائع بدل سکتے ہیں۔ لاہور ملک بورڈ نے بہت چھوٹے پیمانے پر کام کیا ہے اور اس سے لاہور کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ 2000ء میں لاہور کی پچاس لاکھ سے زیادہ آبادی کے لئے ان چیزوں کی مسلسل اور متواتر فراہمی نہایت ضروری ہو جائے گی اور لاہور کے گرد اس علاقے کا حلقہ وسیع ہو جانا چاہیے۔

توازن کی ضرورت

مستقبل کے لاہور کی منصوبہ بندی کرتے وقت آبادی میں اضافے اور ضروریات زندگی کی فراہمی کے درمیان توازن کو برقرار رکھنا سب سے اہم پہلو ہے۔ ساتھ ہی ساتھ لاہور کی پرانی آبادی کو وقت کے نئے تقاضوں سے اس طرح ہم آہنگ کرنا ہے کہ لاہور کی ماحولیاتی ترکیب میں کوئی فرق نہ آئے۔ لاہور کا ماحول اپنی مخصوص ضروریات رکھتا ہے اور انہیں برقرار رکھنا ضروری ہے۔ ابھی تک دنیا کے کئی بڑے بڑے شہروں میں اس قسم کا کام ہوا ہے۔ ان میں عظیم تر لندن، نیویارک، ٹوکیو، ماسکو اور فرانس، مغربی جرمنی، بلجیم اور ہالینڈ کے جنگ زدہ شہروں کی مثالیں نہایت اہم ہیں۔ بلجیم میں خاص طور پر شہروں کی از سر نو آبادکاری بڑے عمدہ اور سوچے سمجھے طریقے سے ہوئی ہے۔ ان ترقی یافتہ ممالک میں شہروں کے مسائل حل کرنے اور انہیں وسعت دینے کے لئے جو خصوصی اقدامات کیے گئے ہیں، وہ پاکستان اور لاہور کی ضروریات کے لئے پورے طور پر قابل عمل نہیں ہیں لیکن ان کے لیے جو اصول وضع کیے گئے ہیں، وہ یقیناً قابل غور ہیں۔ مختصراً انہیں یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

1- شہر کے حصوں مثلاً رہائشی، تجارتی اور صنعتی علاقوں کی اس طرح سے ترتیب کہ یہ کم سے کم لاگت اور آپس میں تصادم کے بغیر کام کر سکیں۔

2- اندرونی و بیرونی آمد و رفت کا ایسا نظام تیار کرنا جس میں تمام قسم کی ٹریفک اور سواریوں کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔

3- شہر کی ترقی کے لئے ایسے مواقع پیدا کرنا جن کی وجہ سے عمارات کے حجم، سورج کی روشنی اور کھلی جگہوں کا معیار برقرار رہے۔ اس میں پارک اور کھیلوں کے میدان تفریح گاہوں اور

تجارتی و صنعتی علاقوں کی حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق ترتیب شامل ہے۔

4- شہر کے مختلف طبقوں کے لئے محفوظ اور آرام دہ رہائشی علاقوں کی تعمیر اور ان میں کئی قسم کی رہائشی سہولتوں اور متبادل رہائشی امکانات کو بہم پہنچانا۔

5- شہر کی موجودہ اور مستقبل کی ضروریات کے لئے آب رسانی، برساتی نکاس اور ذرائع موصلات، ایندھن، برقی قوت اور دیگر ضروریات زندگی بہم پہنچانے کے لئے سستا محفوظ اور قابل اعتبار نظام قائم کرنا۔

6- شہر کو معیار، جائے وقوع اور حجم کے لحاظ سے مختلف النوع تفریحی تعلیمی اور دوسری سہولتوں کی فراہمی۔

7- شہر کی خصوصیات اور اس کے ماحول کو برقرار رکھنے کے لئے اقدامات، تاریخی عمارات اور باغات کا تحفظ اور پیدل ٹریفک کی حفاظت لازمی امور ہیں۔

8- شہر کے اردگرد ایک ایسا علاقہ قائم کرنا جو اس کی موجودہ اور مستقبل کی ضروریات کے لئے دودھ، ڈیری اور پولٹری کی مصنوعات، سبزیاں اور پھل وغیرہ فراہم کر سکے۔ اس میں شہر کی ترقی کے ساتھ ساتھ وسعت کی لچک ہونی چاہیے۔

ترقی کی رفتار سست ہے

ان اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی تک لاہور کی ترقیاتی اور شہری منصوبہ بندی میں بہت سے بنیادی نقائص موجود ہیں۔ اگر خوش فکری سے کام لیا جائے اور لاہور کو 2000ء کے ایک شہر کی حیثیت سے دیکھا جائے جو کہ جدید تقاضوں کے مطابق ترتیب دیا گیا ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کا مرکزی علاقہ شاہراہ قائداعظم (مال روڈ) نہیں رہے گا۔ شاہدرہ سے آگے صنعتی ترقی ایک حد پر پہنچ کر رک جائے گی اور لاہور کے مرکزی رہائشی علاقوں میں اکثر و بیشتر تجارتی مراکز کی حیثیت اختیار کر لیں گے۔ بادامی باغ اور برانڈرتھ روڈ کے صنعتی علاقے بھی اس دباؤ کے آگے ہتھیار ڈال دیں گے۔ لاہور میں ذرائع نقل و حمل میں ایک بہت بڑی تبدیلی آ جائے گی اور موجودہ نظام جس میں بسیں، تانگے اور سائیکلیں شامل ہیں وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے گا۔ زیر زمین یا لٹکی ہوئی ریل گاڑیوں

(مونوریل) کی موجودگی بھی عین ممکن ہے۔ پانی کی بہم رسانی کے لئے ٹیوب ویل، دریا یا نہر کا مصفا پانی حاصل کرنے کے لیے شہر کے شمال مغربی حصے میں بڑے پیمانے پر پلانٹ لگانا ضروری ہو جائے گا۔ شادمان کالونی اور لارنس روڈ، لٹن روڈ اور انارکلی کے علاقے شہری ضروریات بدل جانے سے از سر نو تعمیر کیے جائیں گے۔ یہی حال میکلوڈ روڈ، قلعہ گوجر سنگھ اور دھوبی منڈی (پرانی انارکلی) کے علاقوں کا ہوگا۔ لاہور کو وسیع شہری آبادی کے پیش نظر ایک سے زیادہ ریلوے اسٹیشن ضروری ہو جائیں گے۔ ملتان روڈ پر نیم خود کفیل آبادیوں کی دور تک بڑھتے چلے جانے کی امید ہے۔ لاہور کے صنعتی علاقوں کے لیے بھی اسی جانب زیادہ گنجائش ہے۔ شہر کے پھیلاؤ کے راستے میں ممکن رکاوٹیں، نالہ ہڈیارہ اور دریائے راوی ہیں۔ ان رکاوٹوں سے پہلے جس قدر علاقہ ہے وہ 2000ء تک کے اضافے کے لئے کافی ہے۔ لاہور کے ایک بین الاقوامی شہر بن جانے کے امکانات اگر چہ زیادہ روشن نہیں لیکن ماسکو، کابل، پشاور، لاہور، ڈھاکہ، ٹوکیو کا ایک فضائی راستہ قائم ہوا ہے جس سے اس روٹ پر مزید ٹریفک کی امید کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سیاحت اور تجارت کے فروغ سے لاہور ایک جدید شہر کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ ایشیا اور مشرقی بعید کے لئے اقتصادی کمیشن (ECAFE) نے ٹرانس ایشین ریلوے اور شاہراہ کا منصوبہ بنایا ہے جو یورپ کے مواصلاتی نظام کو ترکی، ایران، پاکستان، بھارت، برما، تھائی لینڈ اور کمبوڈیا کے راستے سائیگون (ویت نام) تک وسعت دیتا ہے۔ اس صورت میں لاہور اس عظیم مواصلاتی سلسلے میں ایک اہم مقام پر واقع ہوگا اور اس کا ایک بین الاقوامی شہر بن جانا خالی از امکان نہیں ہے۔ (1970ء)

تبدیلی کے تیس سال

لاہور اس وقت نہایت اہم مقام پر ہے اسے ایک تاریخی شہر سے ایک عظیم تر شہر میں تبدیل ہونا ہے۔ 2000ء تک کے تیس سال اسی تبدیلی کے لیے اہم عرصہ ہے۔ لاہور جو ہمیشہ سے انفرادی خوبصورتی اور دلکشی کا مرکز رہا ہے، مستقبل میں ان خصوصیات کو برقرار رکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ لاہور کے ماحول کو اس کا حسین ترین روپ دینے کے لئے بڑے پیمانے پر شجر کاری اور کھلی جگہوں، باغوں اور تفریح گاہوں کی تعمیر لازمی ہے۔ نہر اپر باری دوآب کے دونوں کناروں پر دھرم پورہ سے ملتان روڈ پر نیاز بیگ تک ایک نہایت عمدہ سیر گاہ بنائی جا سکتی ہے۔ لاہور کو باغوں کا شہر بنانے کے لئے شہر کی نئی آبادی سرسبز

کھلے میدان چھوڑ کر ہونی چاہیے۔ لاہور کے تاریخی مقامات کا تحفظ بھی نہایت ضروری ہے۔ خصوصاً بیگم پورہ، اندرون شہر اور باغ دلکشا (شاہدرہ) کو فوری طور پر محفوظ علاقہ قرار دے دینا چاہیے۔ لاہور اور (مغربی) پاکستان کے دیگر شہروں کے درمیان آمدورفت کے نظام کو بھی وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ اسلام آباد، پاکستان کا دارالحکومت ہونے کی وجہ سے لاہور کے لئے کشش کا باعث ہوگا۔ کراچی اور لاہور کی باہمی تجارت بھی بڑھ جائے گی۔ اس صورت میں بین الاضلاعی اور بین الصوبائی آمدورفت کا نظام ازسرنو ترتیب دینا ہوگا۔ لاہور 2000ء میں پاکستان کا سب سے خوبصورت شہر ہوسکتا ہے۔ اس کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ ضرورت صرف صحیح لائحہ عمل اور ترتیب کی ہے۔ لاہور جو مغلوں کا محبوب شہر رہا ہے، مستقبل میں پاکستانی قوم کی امنگوں اور آرزوؤں کا فنکارانہ اظہار بن سکتا ہے۔

O

بیرونی دنیا سے لاہور کا اتصال اور نظامِ مواصلات

دور جدید کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت زمان و مکان کے نئے پیمانے ہیں۔ دنیا سکڑ کر اتنی تنگ ہوگئی ہے کہ آج انسانی آبادی کو علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم کرنا ناممکن ہوتا جارہا ہے۔ دنیا کے آباد علاقے ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ ذرائع نقل وحمل اور اطلاعات ومعلومات کی تیز اور موثر نشرو اشاعت ہماری زندگیوں میں ایک بڑا انقلاب لے آئی ہے۔ پاکستان میں بھی یہ ترقی باآسانی دیکھی جا سکتی ہے۔ لاہور کی مثال لیجئے شاید آپ نے کبھی نہ سوچا ہو کہ لاہور بیرونی دنیا سے اس طرح منسلک ہے کہ اس رابطے کو ختم کردینے سے شہر کا تمام نظام درہم برہم ہوسکتا ہے۔ ہم غیر محسوس طور پر ہر وقت اور ہر جگہ بیرونی دنیا سے رابطہ قائم کیے رہتے ہیں اور اسی لیے لاہور ایک الگ تھلگ انسانی آبادی کے بجائے ایک ایسا شہر ہے جو ایک بہت وسیع دائرے میں ایک مقام رکھتا ہے اور یہ دائرہ تمام دنیا کا نظام نقل وحمل اور نظام اطلاعات رسانی ہے۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے دنیا میں انسانی آبادی کے مختلف علاقوں میں زندگی سادہ اور خود کفیل تھی۔ ان علاقوں کے درمیان دشوار گزار ریگستان، جنگلات، پہاڑ اور سمندر وغیرہ حائل تھے۔ رفتہ رفتہ عقل انسانی ان سب مشکلات پر قابو پاتی چلی گئی، فاصلے نزدیک سے نزدیک تر ہوتے چلے گئے۔ ایجادات و انکشافات میں ترقی کی شرح اب پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور صدیوں کے فاصلے دنوں میں طے کیے جا رہے ہیں۔ مشینی دماغ کمپیوٹر نے ہمارے سوچنے کا انداز بدل دیا ہے۔ کام اور وقت کی پرانی اکائیاں بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ ایسے طویل اور مشکل حسابی مسئلے جنہیں حل کرنے کے لئے ایک زندگی کا عرصہ چاہیے ان مشینوں کے ذریعے لمحوں میں حل کر لیے جاتے ہیں۔ یہ ترقی انسان کی مشترکہ وارثت اور اس کا حق ہے۔

انسانی علوم وفنون اور قدرت کے دیئے ہوئے وسائل سے کام لینے میں یہ تیز رفتار ترقی بڑی حد تک بہتر ذرائع نقل وحمل وذرائع نشرواشاعت کی مرہون منت ہے۔ اطلاعات ومعلومات کا تبادلہ اب

اس قدر آسان اور تیز ہے کہ انسان کی مشترکہ جدوجہد میں ایک رابطہ پیدا ہو گیا ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے کے حالات پر غور کیجئے۔ سست رو بیل گاڑیاں، اونٹوں کے قافلے، گھوڑے اور خچر، بادبانی کشتیاں اور اسی طرح کی دیگر سست رفتار سواریاں آمدورفت کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ سڑکوں کی حالت بھی خراب تھی۔ پرامن اور تہذیب یافتہ علاقوں میں گھوڑ سواروں یا کبوتروں کے ذریعے ڈاک کا نظام قائم تھا۔ خبریں پہنچانے اور ان کی نشرواشاعت کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ تجارت اور سیاحت کے شوقین اس خارزار کو عبور کرتے تو نئی نئی چیزیں دیکھ کر حیران ہوتے۔ ان کی لائی ہوئی خبریں اور کہانیاں افواہوں کی شکل میں پھیلتی تھیں۔ آج دنیا کتنی مختلف ہے۔ ہوائی جہاز ہر روز دنیا کے مختلف شہروں کے درمیان ہزاروں پروازیں کرتے ہیں۔ وائرلیس اور ریڈیو نے اطلاعات کا نظام برق رفتار بنا دیا ہے۔ فاصلے اہمیت نہیں رکھتے اور تمام دنیا سمٹ کر ایک گاؤں بن گئی ہے۔

وسائل نقل و حمل اور ذرائع نشرواشاعت کی ہمہ گیر ترقی لاہور جیسے بڑے شہر میں نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ لاہور جغرافیائی اعتبار سے بڑے خوش قسمت علاقے میں واقع ہے۔ آبادی کا پھیلاؤ پنجاب کے میدانوں میں دور تک پایا جاتا ہے اور مختلف شہروں و دیہات سے لاہور براہ راست ملا ہوا ہے۔ یہ نظام مواصلات لاہور کے لئے جزو لاینفک ہے۔ لاہور کی روزمرہ زندگی میں ہزاروں چیزیں اس نظام کی بدولت دستیاب ہیں۔ ہر چند کہ ابھی اس نظام میں بہت سے پہلو اصلاح کے متقاضی ہیں۔

لاہور شہر کو بیرونی دنیا سے ملانے والے ذرائع مندرجہ ذیل ہیں:

1- شاہراہیں 2- ریلوے 3- فضائی راستے 4- دریائی راستے 5- تار ٹیلی فون 6- ریڈیو ٹیلیویژن 7- رصدگاہیں 8- آب رسانی نہریں وغیرہ 9- بجلی کا قومی گرڈ 10- قدرتی گیس پائپ لائن۔

لاہور سڑک کے ذریعے مندرجہ ذیل علاقوں سے ملا ہوا ہے:

اول: شاہدرہ کے مقام پر گوجرانوالہ، سرگودھا اور لائل پور (فیصل آباد) سے سڑکیں آکر ملتی ہیں۔ گوجرانوالہ سے آنے والے شاہراہ اعظم پاکستان کی سب سے اہم سڑک ہے اور پشاور، راولپنڈی، جہلم، گجرات اور گوجرانوالہ کے راستے لاہور تک پہنچتی ہے۔ گوجرانوالہ سڑک کے ذریعے سیالکوٹ سے ملا ہوا ہے اور اس طرح سیالکوٹ اور لاہور کے درمیان رابطہ بھی اسی سڑک کے ذریعے قائم ہے۔ گوجرانوالہ، گجرات، سیالکوٹ اور راولپنڈی کے صنعتی علاقوں کی پیداوار لاہور تک اسی سڑک کے ذریعہ

پہنچائی جاتی ہے۔ البتہ ریلوے لائن موجود ہونے کی وجہ سے دباؤ خاصا کم ہے۔ چند اشیاء مثلاً عمارتی و زیبائشی پتھر، لکڑی، میوہ جات، معدنی نمک و دیگر معدنیات اور افغانستان سے برآمد کی جانے والی چیزیں صرف اسی سڑک کے ذریعے لاہور لائی جاتی ہیں۔ (1970ء) صنعتی پیداوار میں کراکری، مٹی کے برتن، کٹلری، کھیل کا سامان، ظروف، بجلی کی گھریلو استعمال کی اشیاء، کیمیائی مرکبات، کپڑا، چمڑے کی مصنوعات اور دیگر اشیاء لاہور آتی ہیں۔ علاوہ ازیں اسلام آباد پاکستان کا دارالحکومت ہونے کی وجہ سے لاہور کے لئے کشش رکھتا ہے اور کاروبار وغیرہ کے لئے مسافروں کی آمدورفت جاری رہتی ہے۔ دوسری سڑک لائل پور (فیصل آباد) سے جڑانوالہ کے راستے شاہدرہ پہنچتی ہے۔ لائل پور سے زرعی پیداوار، کپڑا اور کیمیائی مرکبات وغیرہ لاہور جاتے ہیں۔ تیسری سڑک سرگودھا سے شیخوپورہ کے راستے شاہدرہ آتی ہے اور اس سڑک کے ذریعے زرعی پیداوار اور معدنیات لاہور پہنچتی ہیں۔ شاہدرہ سے یہ تین سڑکیں ایک بڑی سڑک یعنی شاہراہ اعظم کی شکل میں لاہور پہنچتی ہیں۔ دریائے راوی عبور کرنے کے لئے تین پل ہیں۔ (1970ء) ایک سڑک کا پرانا پل جو آج کل سست رفتار ٹریفک کے لئے مخصوص ہے۔ دوسرا نیا پل جو 1968ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا، اس کے ذریعے تمام تیز رفتار ٹریفک لاہور آتی ہے اور تیسرا پل ریلوے لائن کے لئے مخصوص ہے۔ دریا پار کرتے ہی سڑک تین شاخوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک سڑک لاہور شہر کو آتی ہے جسے راوی روڈ کہا جاتا ہے۔ دوسری سڑک مشرق کی طرف جاتی ہے اسے شمالی بند روڈ کہتے ہیں۔ یہ سڑک لاہور کے حفاظتی بند پر سے ہوتی ہوئی محمود بوٹی تک پہنچتی ہے اور وہاں سے جنوب کی جانب مڑتی ہے۔ داروغہ والا کے قریب یہ شاہراہ اعظم سے مل جاتی ہے۔ تیسری شاخ جنوب کی جانب حفاظتی بند سے ہوتی ہوئی ملتان روڈ سے جا ملتی ہے۔ لاہور سے آنے اور جانے والی لاریاں اور ٹرک بند روڈ استعمال کرتے ہیں۔ راوی روڈ سے بادامی باغ کو مڑا جاتا ہے جہاں جنرل بس سٹینڈ واقع ہے۔ جنرل بس سٹینڈ لاہور میں آنے والی تمام بسوں کا ٹرمینل ہے۔ یہاں شہر کی اندرونی ٹریفک کا نظام ختم ہوتا ہے اور بین الاضلاعی ٹریفک کا نظام شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک نظام سے دوسرے نظام میں تبدیل ہونے کے انتظامات مہیا کرنا نہایت اہم ہے۔ یہ مرحلہ سفر کا دشوار ترین حصہ ہوتا ہے۔

دوم: لاہور کے مشرقی حصے میں شالامار باغ کے راستے سے شاہراہ اعظم شہر کے نظام آمدورفت میں آ کر ملتی ہے۔ یہ سڑک بھارت کے شہر امرتسر کو لاہور سے ملاتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے یہ سڑک

بین الاقوامی اہمیت کی حامل تھی اور بھارت کے تمام شہر اسی سڑک کے ذریعہ لاہور سے ملے ہوئے تھے لیکن 1965ء کی جنگ کے بعد واہگہ کی سرحد بند کر دی گئی ہے۔(1970ء) اب یہ سڑک لاہور کو واہگہ، جلو، باٹا پور وغیرہ سے ملاتی ہے اور ان نواحی قصبات سے زرعی صنعتی پیداوار اور کارکن لاہور آتے ہیں۔

سوم: نہر اپر باری دوآب کے ساتھ ساتھ پکی سڑک لاہور آتی ہے اور مشرق میں واقع سرحدی دیہات سے لاہور کا رابطہ قائم کرتی ہے۔ یہ سڑک محکمہ نہر کے افسروں کے لئے معائنہ کے دوران مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس پر بھاری ٹریفک روکنے کے لئے رکاوٹیں لگائی گئیں ہیں۔(1970ء)

چہارم: لاہور چھاؤنی میں صدر بازار کے نزدیک لاہور ہر یکے روڈ آ کر ملتی ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے یہ سڑک امرتسر اور فیروز پور کے قصبات کو لاہور سے ملاتی تھی۔ اب اس کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔ برکی اور ہڈیارہ کے سرحدی مقامات اسی سڑک پر واقع ہیں۔

پنجم: فیروز پور روڈ کسی زمانے میں لاہور کو فیروز پور سے ملاتی تھی۔ اب یہ قصور اور لاہور کے درمیان نہایت مصروف سڑک ہے۔ گنڈا سنگھ والا میں سرحد پار کرنے کے انتظامات ہیں۔(1970ء) اس لیے لاہور سے یہ سڑک بین الاقوامی اہمیت کی ہو جاتی ہے۔ لاہور جنرل ہسپتال کے نزدیک ایک سڑک لاہور چھاؤنی سے آ ملتی ہے۔ کوٹ لکھپت کے نزدیک ایک سڑک مغرب کے طرف صنعتی علاقے کو جاتی ہے۔ اس سڑک کو مستقبل میں ملتان روڈ تک بڑھایا جا سکتا ہے(1970ء)۔ فیروز پور روڈ، ماڈل ٹاؤن کے قریب لاہور کے نظام آمدورفت سے ملتی ہے۔(1970ء)

ششم: نہر اپر باری دوآب کے کنارے کنارے آنے والی سڑک مغرب تک چلی گئی ہے۔ یہ سڑک مغرب میں واقع قصبات مثلاً علی رضا آباد اور رائے ونڈ کو لاہور سے ملاتی ہے۔ اس سڑک پر بھاری ٹریفک روکنے کے لئے تنصیبات موجود ہیں۔(1970ء)

ہفتم: لاہور کے مغرب میں واقع علاقے ملتان روڈ کے ذریعے لاہور سے ملے ہوئے ہیں۔ یہ سڑک کراچی، حیدر آباد، سکھر، ملتان، ساہیوال، اوکاڑہ وغیرہ کے راستے لاہور تک آتی ہے۔ اس وسیع علاقے کی زرعی و صنعتی پیداوار کے علاوہ کراچی اور کوئٹہ کے راستے منگوائے جانے والے غیر ملکی سامان کا کچھ حصہ بھی اسی راستے سے لاہور پہنچتا ہے۔ ملتان روڈ، نواں کوٹ کے قریب لاہور کے اندرونی نظام آمدورفت میں مدغم ہوتی ہے۔(1970ء) اس سے پہلے نیاز بیگ کے مقام پر نہر اپر باری دوآب کے

ساتھ ساتھ آنے والی سڑک ملتان روڈ سے ملتی ہے۔ پنڈ گکے زئی (منصورہ) کے نزدیک فیروز پور روڈ سے آنے والی وحدت روڈ (کچاملتان روڈ) بھی ملتان روڈ سے ملتی ہے۔اپنی اہمیت کے اعتبار سے ملتان روڈ لاہور آنے والی سڑکوں میں خاصی مقام رکھتی ہے۔ مستقبل قریب میں یہ کراچی سے آنے والے قومی شاہراہ میں تبدیل کردی جائے گی۔(1970ء) ملتان روڈ، لاہور کو دودھ، سبزیاں اجناس اور دیگر کئی زرعی اور صنعتی پیداوار بہم پہچانے والے علاقوں سے ملاتی ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے پتا چلتا ہے کہ فی الحال (1970ء) لاہور تک پہنچنے والی سڑکوں پر اہم مقامات مندرجہ ذیل ہیں: 1- شاہدرہ 2- داروغہ والا 3- ہربنس پورہ 4- لاہور جنرل ہسپتال 5- نیاز بیگ: ان مقامات پر آنے والی سڑکیں لاہور کے اندرونی نظام آمدروفت سے ملتی ہیں۔ ماضی میں باغبانپورہ، لاہور چھاؤنی، مزنگ چونگی، چوبرجی اور بادامی باغ وغیرہ اس اہمیت کے حامل تھے۔شہر کی وسعت کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آئندہ بھی ان مقامات میں تبدیلی ہوسکتی ہے اور شہر کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اندرونی نظام کی آمدورفت بھی وسیع سے وسیع ہوتا جارہا ہے۔ بین الاضلاعی شاہروں پر اس قسم کی ٹریفک ہمیشہ ایک مسئلہ رہی ہے۔ چنانچہ مستقبل میں اس مسئلے کا نیا حل دریافت کرنا ہوگا۔

لاہور، پاکستان ویسٹرن ریلوے (پاکستان ریلوے) کا ہیڈ کوارٹر اور اہم جنکشن ہے۔ شمال کی طرف سے پشاور، راولپنڈی، لالہ موسیٰ، وزیر آباد، گوجرانوالہ کے راستے شاہدرہ جنکشن تک یہ ریلوے لائن ہے۔ شاہدرہ جنکشن پر نارووال، شیخوپورہ اور جڑانوالہ سے برانچ لائنیں آکر ملتی ہے۔ شاہدرہ کے بعد دریائے راوی کے پل کو عبور کرنے پر بادامی باغ اسٹیشن آتا ہے۔ یہ لاہور ریلوے اسٹیشن کے نظام سے منسلک ہے۔ مال اسباب کے اتارنے چڑھانے کے لیے یہی ریلوے اسٹیشن استعمال کیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے بادامی باغ کے نزدیک صنعتی علاقہ وجود میں آیا اور ابھی تک قائم ہے۔ بادامی باغ کے بعد لاہور ریلوے اسٹیشن ہے۔ یہاں ایک اہم ٹرمینل ہے۔ شہر کے مختلف حصوں سے سڑکیں، ریلوے اسٹیشن آتی ہیں اور نظام آمدورفت میں تبدیلی کے انتظامات ہیں۔ لاہور ریلوے اسٹیشن کے ساتھ ریلوے کا وسیع یارڈ ہے جس میں سٹور شنٹنگ یارڈ اور دیگر مقامات ہیں۔ ریلوے لائن سے ملحق لوکو ورکشاپ، کیرج شاپ، انجن سٹینڈ، جنرل سٹور اور ریلوے کالونی کے علاقے ہیں۔ انجن سٹینڈ کے نزدیک ریلوے لائن کی دو

شاخیں ہوتی ہیں۔ایک مشرق اور امرتسر کی جانب جاتی ہے اور دوسری جنوب اور مغرب میں لاہور چھاؤنی، ساہیوال، ملتان اور کراچی۔ پہلی لائن پر مغل پورہ ریلوے اسٹیشن ہے۔ یہاں سے لاہور چھاؤنی کے لیے برانچ لائن جنوب کو جاتی ہے جوائر پورٹ تک پہنچتی ہے (یہ لائن مسافر گاڑیوں کے لیے استعمال نہیں ہوتی)۔ مغلپورہ کے بعد اس ریلوے لائن پر ہر بنس پورہ سٹیشن ہے۔ بعد میں یہ لائن جلو تک پہنچتی ہے۔اس سے آگے سلسلہ منقطع کر دیا گیا ہے۔(1970ء) لاہور سے دوسری لائن جنوب کو جاتی ہے۔ یہ ریلوے لائن لاہور شہر اور لاہور چھاؤنی کے درمیان ایک حد کا کام دیتی ہے۔لاہور چھاؤنی اسٹیشن کی وجہ سے شہر کے جنوبی علاقے اور چھاؤنی کے مال واسباب اتارنے چڑھانے کے لئے اس اسٹیشن کو استعمال کیا جاتا ہے۔گلبرگ انڈسٹریل ایریا اسی سہولت کے پیش نظر بنایا گیا ہے۔لاہور چھاؤنی سے آگے والٹن ٹریننگ سکول اور کوٹ لکھپت ریلوے اسٹیشن آتے ہیں۔ کوٹ لکھپت انڈسٹریل ایریا کے لئے کوٹ لکھپت کے مقام پر فیروز پور روڈ کو ریلوے لائن کاٹتی ہے اور اس مقام کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ریلوے نے کوٹ لکھپت کو بادامی باغ یا شاہدرہ سے ملانے کا منصوبہ بھی بنایا تھا جسے لاہور سرکلر ریلوے کا نام دیا گیا تھا لیکن ابھی تک اس منصوبے کی تفصیل نہیں دی گئی اور نہ ہی اس کے قابل عمل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ (1970ء) لاہور کے لئے نظام وآمدورفت میں جدید انتظامات سے پہلے اس قسم کے منصوبے تیار کرنے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ مستقبل میں لاہور کی شہری آمدورفت میں ریلوے لائن کا استعمال ممکن ہے لیکن ٹریفک کا مسئلہ عمدگی سے حل کرنے کے لئے تمام قسم کے قابل حصول ذرائع آمدروفت کو ایک نظام کے تحت لانا ہوگا تا کہ غیر ضروری اخراجات اور نقصانات سے بچایا جا سکے۔

لاہور میں پہلا سول ائر پورٹ والٹن کے مقام پر بنایا گیا۔ یہ ہوائی اڈہ فیروز پور روڈ اور لاہور چھاؤنی سے سڑک کے ذریعے ملا ہوا ہے۔ آج کل یہاں سے لاہور فلائنگ سکول کے تربیتی طیارے پرواز کرتے ہیں۔شہری ہوابازی کے لئے لاہور چھاؤنی میں فوجی فضائی مستقر کو لاہور ائر پورٹ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یہاں جیٹ طیاروں کے لئے رن وے بنالیا گیا ہے اور بین الاقوامی پروازوں کے لئے یہ ہوائی اڈہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال یہاں پشاور، راولپنڈی، لائل پور، ملتان، کوئٹہ، حیدر آباد اور کراچی کے لیے ہوائی جہاز آتے جاتے ہیں۔ ڈھاکہ اور لاہور کے مابین بھی فضائی رابطہ قائم ہے۔

(1970ء)لاہور کا ہوائی اڈہ سڑک کے ذریعے لاہور چھاؤنی اور لاہور شہر سے ملا ہوا ہے۔

لاہور پہنچنے کے لئے کوئی قابل ذکر دریائی راستہ موجود نہیں ہے البتہ راوی کے پار چھوٹے چھوٹے قصبات سے کشتی کے ذریعے آمدورفت روزانہ ہوتی ہے۔ مختلف مقامات پر چھوٹی کشتیوں کے لئے گھاٹ بنے ہوئے ہیں۔ سب سے اہم شرقپور اور لاہور کے درمیان کشتی کا راستہ ہے۔

لاہور پیغام رسانی کے مختلف نظاموں سے منسلک ہے۔ ٹیلی گراف کی لائنز، راولپنڈی، لائل پور، جلو، ساہی وال اور قصور کی جانب سے آتی ہیں۔ مرکزی تار گھر ان کو کنٹرول کرتا ہے۔ ریلوے لائن کا اپنا نظام ہے جو مین لائن یعنی راولپنڈی، لاہور، ملتان وغیرہ اور برانچ لائنز یعنی لاہور امرتسر کے ساتھ ساتھ ہے۔ ٹیلیفون لائنز راولپنڈی، لائل پور، ساہی وال، جلو، قصور کی جانب سے آتی ہیں۔ لاہور میں مرکزی، چھاؤنی اور گلبرگ کے ٹیلیفون ایکسچینج ٹیلیفون کے نظام کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اب کراچی، راولپنڈی، لائل پور، ملتان اور سرگودھا کے لئے ڈائریکٹ ڈائیلنگ بھی شروع کر دی گئی ہے۔ وائرلیس کے انتظامات بھی ہیں۔ واپڈا، نہر، قدرتی گیس، پولیس اور فوج کے جداگانہ انتظامات ہیں۔ وائرلیس کے ذریعے پیغام رسانی کو صنعت اور تجارت بینکنگ، شہری ہوابازی اور خبریں پہنچانے کے لئے بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ تار اور ٹیلی فون کے نظام مزید اصلاح کے متقاضی ہیں۔ تیز اور موثر پیغام رسانی کسی شہر کی ترقی پذیر صنعت وتجارت، ذرائع آمدورفت اور دنیا سے براہ راست رابطہ کے لئے سب سے اہم چیز خیال کی جاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ سہولیات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ ان تیز رفتار ذرائع کی ماہیت اور قوت کار کو پوری طرح سمجھا جائے اور مستقبل کے لئے منصوبہ بندی کرتے وقت شہر کی پھیلتی ہوئی آبادی اور اس کی وسیع تر ضروریات کا خیال رکھا جائے۔ روز کا معمول ہے کہ ٹیلی فون کے تار بچھانے کے لئے سڑک توڑی جاتی ہے۔ نئی لائنز کو بے کار قرار دے دیا جاتا ہے۔ زیادہ مہنگی اور بڑی لائنز بنائی جاتی ہیں۔ یہ سب منصوبہ بندی کے فقدان یا غلط اندازوں کی بدولت ہے۔ تار اور ٹیلی فون کے نظام کو سہل اور اور تیز بنانے کے لئے ٹیلی فون ایکسچینج کی صورت حال کو صحیح رکھنا ضروری ہے۔ یہاں یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ تار اور ٹیلی فون کا نظام جو عوام کی خدمت کے لئے قائم ہے، ابھی تک پوری طرح استعمال نہیں کیا گیا۔ (1970ء) ٹیلی فون کی مثال سامنے ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ

پیغام پہنچانا ہر ایک شخص کی ضرورت ہے۔ اگر ٹیلی فون کا نظام صحیح طور پر کارآمد ہو تو سڑکوں پر رش کو بڑی حد تک کم کیا جا سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لاہور کی بیس لاکھ آبادی کے لئے صرف ایک یا دو جگہ پر ایسا انتظام ہے (1970ء) جہاں خلوت میں ٹیلی فون پر بات چیت کی جا سکتی ہے۔ جنرل پوسٹ آفس کا واحد ٹیلی فون بوتھ اکثر و بیشتر خراب رہتا ہے۔ لاہور کے دیگر ڈاک خانوں میں پیسے ادا کرنے کے بعد رسید ملتی ہے اور پھر ڈاک خانے کے شور میں ٹیلی فون کرنا ہوتا ہے۔ (1970ء) پبلک ٹیلی فون بوتھ آج کل کے بڑے شہروں کی ضرورت ہے۔ شہر کے ہر خاندان کو ٹیلی فون مہیا کرنا ممکن نہیں۔ پبلک، ٹیلی فون بوتھ اس مشکل کا آسان حل ہیں۔ ان سے شہر کی ٹریفک کو ممکنہ حد تک کم رکھنے اور ذرائع آمدورفت میں غیر ضروری اضافے نیز ترقیاتی منصوبوں پر کنٹرول کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

O

منصوبہ آرائش لاہور کا جائزہ

باغوں کا شہر لاہور کا نیا روپ یہ ہے کہ دھول، کوڑے کرکٹ اور گندے پانی کی فراوانی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ٹانگوں، سائیکلوں، بسوں اور سڑکوں کے ساتھ ساتھ پیدل چلنے والوں کا ایک بے قابو ہجوم یہاں کی سڑکوں پر سرگرداں ہے۔ گرد و غبار کے بادل لاہور کے بہادر شہری اپنے پھیپھڑوں میں اتارنے پر مجبور ہیں۔ انہیں سڑکوں پر کہیں خندقیں ہیں کہیں گندا پانی کھڑا ہے اور کہیں اس خون کے دھبے ہیں جو کچھ دیر پہلے کسی حادثہ میں زخمی یا ہلاک ہونے والے نے شہر لاہور کی نذر کیا ہے۔ اکھڑی ہوئی سڑکوں، گرد آلود درختوں، گندی گلیوں اور بوسیدہ عمارتوں کے اس مجموعے کو عروس البلاد کہہ لیجئے یا پاکستان کا دل، یہ لاہور ہے۔ زندہ دلوں کا شہر، ثقافت اور تعلیم کا مرکز، اہم تاریخی مقام اور پنجاب کا دارالحکومت لاہور بحیثیت ایک شہر جو منظر پیش کرتا ہے اسے کسی صورت بھی قابل فخر نہیں کہا جا سکتا۔ شہریوں اور سیاحوں کے لئے لاہور جو کشش اور ساتھ ہی ساتھ جو مشکلات رکھتا ہے ان سب کا لب لباب یہ ہے کہ لاہور ایک محبوب ہے جس کا قرب سب کو عزیز ہے لیکن یہی قرب اسے چاہنے والوں کے لئے سم قاتل بن سکتا ہے۔ لاہور میں پیسہ ہے، روزگار ہے، تعلیم، تفریح اور ثقافتی سرگرمیاں ہیں لیکن اس کا غیر صحت مند ماحول، آمد و رفت میں پریشانی، مہنگائی، شور، سماج دشمن عناصر، بدصورتی، اور بدنمائی ان خوبیوں پر حاوی آتی جا رہی ہیں۔ لاہور کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جنہیں حل کرنے کے لئے پیشہ وارانہ مشورے، سرمائے اور تنظیم کی ضرورت ہے ان سب مسائل کو بہ یک وقت حل کرنا بلاشبہ ایک مشکل کام ہے لیکن انہیں حل کرنے کے لیے منصوبہ بندی اور لائحہ عمل تیار کرنا عین ممکن ہے اور یہ وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے۔

لاہور کے ماحول کی اصلاح کے لئے تمام جدوجہد ایک واضح مقصد کے تحت ہونی چاہیے تا کہ تمام کوششوں کا راستہ متعین ہو اور مختلف مقامات اور مختلف اوقات پر کیا جانے والا کام اپنی نوعیت اور مقصدیت کے اعتبار سے ہم آہنگ ہو۔ اگر ہم لاہور کے شہریوں کے لئے آرام دہ اور صحت مند ماحول

مہیا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس شہر کی روح اور اس کی ضرورتوں کو سمجھنا ہوگا۔ شہر اور اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے علاقے کی اقتصادی، معاشرتی، جغرافیائی اور تاریخی حیثیت کے پیش نظر منصوبہ بندی کے لیے ایسا لائحہ عمل تیار کیا جا سکتا ہے جو شہر اور شہریوں کی بقا اور خوشگوار زندگی کے لئے مستقبل میں رہنمائی کا کام سرانجام دے۔ یہ مسئلہ کسی ایک شہر کا نہیں کسی ایک علاقے کا بھی نہیں بلکہ تمام دنیا اس مسئلے سے دو چار ہے۔ شہری آبادی میں اضافے کی شرح بڑھ رہی ہے۔ دیہی علاقوں سے آبادی مسلسل شہروں کی جانب ہجرت کر رہی ہے۔ شہروں میں ترقی کی نئی نئی راہیں بہت جلد ظاہر ہوتی ہیں اور آج کا ذہن یہ سوچتا ہے کہ وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان ذرائع اور سہولیات سے نزدیک تر رہا جائے جس کا عام فہم نام شہر ہے۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں اس مسئلے کی مختلف شکلیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ چاہے وہ ایشیا کا ٹوکیو ہو یا نئے براعظم کا نیویارک، ہر طرف شہری آبادی اور اس کے ساتھ مسائل میں اضافے نے شہروں کی منصوبہ بندی، نظم و نسق، ضروریات کی بہم رسانی اور اقتصادی و معاشرتی زندگی کو بحال رکھنے کی کوششوں کو پہلے سے زیادہ پیچیدہ اور مشکل بنا دیا ہے۔

ہر ملک میں اور ہر شہر میں کچھ عادات اور خدوخال ایسے ہوتے ہیں جنہیں ان کا انفرادی کردار یا شخصیت کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ مقامی خصوصیات ہی ہوتی ہیں جو ہر شہر اور اس کے مسائل کو ایک انفرادی رنگ دیتی ہیں اور انہی کی وجہ سے ہر شہر کے مسائل کو حل کرنے سے پہلے انہیں سمجھنا ضروری ہے۔ شہریوں کا مزاج، ان کی پسند اور ناپسند، تاریخی اور روایتی ماحول، خوبصورتی اور بدصورتی کے تصور اور معیار کی درجہ بندی بھی اسی ضمن میں آتی ہے۔ شہر کی ظاہری شکل و صورت انہی سب باتوں سے بنتی اور بگڑتی رہتی ہے۔ زندگی کے ان گنت معاشی اور عمرانی پہلوؤں کو چھوڑ کر ہم اس وقت صرف ان چیزوں کا جائزہ لے سکتے ہیں جو ہماری آنکھ ہمیں روزمرہ کی زندگی میں دکھاتی ہے۔ ان میں وہ تمام چیزیں اور ان کے وظائف، اظہار و ابلاغ کے ذرائع اور انسان اور قدرت کے بنائے ہوئے وہ تمام مظاہر شامل ہیں جو ہمیں نظر آتے ہیں۔ لاہور کے فنکار، ہنرمند اور معمار منتظر ہیں کہ انہیں لاہور کے تصور کو حقیقت کے روپ میں دیکھنے اور دکھانے کا موقع ملے۔ لیکن مختلف سرکاری و نیم سرکاری اور نجی اداروں کے کام میں ہم آہنگی اس سلسلے میں نہایت ضروری ہے۔ حکومتی سطح پر ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب یہ ادارے انتہائی غیر موثر ثابت ہوئے ہیں۔ بصری ماحول کے ماہرین کو ان اداروں کی طرف سے سرپرستی کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی معلومات اور تجربے سے لاہور کی خوبصورتی کے لئے سائنسی خطوط پر منصوبہ ترتیب دے سکیں اور اس پر عمل

درآمد کرا سکیں۔ اس منصوبے کی نشر و اشاعت اور عوامی ذہن تک اس پیغام کی رسائی بھی نہایت اہم ہے تا کہ اس بڑے منصوبے کے تحت بہت سے چھوٹے چھوٹے منصوبوں میں سرکاری و نجی سطح پر لاہور کو خوبصورت بنانے کا کام جاری ہے۔ لاہور کو اس کا رنگ و روپ واپس دینے اور اسے مثالی شہر بنانے کا یہ کام مشکل اور صبر آزما ضرور ہے لیکن لاہور کے نوجوان ماہرین بصری ماحول کی اپنے شہر سے محبت اور ان کے ولولے کو دیکھتے ہوئے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں لاہور کو خوبصورت تر بنایا جائے گا۔ لاہور میں ماحول کو خوبصورت اور بہتر بنانے کے سلسلے میں جو کچھ ہو رہا ہے یا جو کچھ کیے جانے کی امید کی جا رہی ہے اس میں بیشتر حصہ ان کوششوں کا ہے جو بصری ماحول میں تبدیلیوں سے متعلق ہے۔ جس طرح پانی اور بجلی کی بہم رسانی کا مقصد شہریوں کی اہم ضرورت کو پورا کرنا ہے اور ان کی منصوبہ بندی اور تعمیر کے لئے خاص قسم کے ماہرین اور ہنر مندوں کی ضرورت ہے، اسی طرح شہر کے بصری ماحول کی خوبصورتی اور دل کشی کو برقرار رکھنے اور اضافہ کرنے کے لئے بھی ماہرین کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں جہاں اس حقیقت کو سمجھا اور اس پر عمل کیا گیا ہے، شہر بے جان اینٹ، پتھر اور گارے کے بدنما ڈھیر نہیں رہے بلکہ جیتے جاگتے اور گنگناتے کسی فنکار کا فن پارہ بن گئے ہیں۔

شہر انسانوں کی آبادی کا نام ہے اسے ایسا ہی ہونا چاہیے۔ چنانچہ شہر کی رونق اور زندگی کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ یہاں کے شہری ایک خوشگوار ماحول میں رہیں۔ اس ماحول کے حسن اور رنگینی کو اسی صورت میں قائم رکھا جاسکتا ہے جب اس شعوری مقصد کے تحت کام کیا جائے کہ شہر کی خوبصورتی کو نہ صرف برقرار رکھنا ہے بلکہ اس میں بہترین اضافے بھی کیے جائیں گے۔ شہر کو ماضی کی یادگار اور آثار قدیمہ بنا دینے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ وقت کے تقاضوں کو سمجھا جائے اور شہریوں کے لئے ہم عصر ماحول قائم کیا جائے۔ انسان کے جمالیاتی تقاضوں کی تسکین کے لئے فنون کی ضرورت بڑی اہم ہے اور حواس خمسہ میں سے نظر وہ حس ہے جو بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ بصری ماحول کی دلکشی کے لئے ان فنون اور فنکاروں کی ضرورت ہے جو فنون بصری سے وابستہ ہیں۔ معاشرے میں ان فنکاروں کا وجود غنیمت ہے جو مسلسل کوشش تربیت اور تجربات سے اپنی حس بصری کو غیر معمولی طور پر حساس اور جمالیاتی قدر و قیمت کو جانچنے اور پرکھنے کے قابل بنا لیتے ہیں۔ یہ فنکار جو کچھ تخلیق کرتے ہیں، وہ معاشرے کے لیے باعث افتخار ہوتا ہے۔ بصری ماحول ان فنکاروں کا میدان عمل ہے۔ کسی بھی شہر میں خوبصورتی یا دلکشی کا منصوبہ بناتے وقت ان فنکاروں کا مشورہ اور اعانت نہایت ضروری ہے۔ لاہور جو باغوں کا شہر کہلاتا ہے

آج اس اعزاز کا مستحق نہیں ہے۔ آج لاہور میں جو خوبصورت مقام باقی ہیں وہ بدذوقی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اسی شہر میں جہاں ملک کی قدیم درس گاہیں، ثقافتی وفنی ادارے اور مایہ ناز عالم دانش ور، فنکار اور ماہرین موجود ہیں، یہ حالت ہے کہ شہر کی آرائش و زیبائش کے جو منصوبے بنائے جاتے ہیں وہ اتنے ناپائیدار اور ناموزوں ثابت ہوتے ہیں کہ بدقسمت جگہیں پہلے کے مقابلے میں زیادہ بدنما ہو جاتی ہیں۔ یہ مسئلہ شہریوں کے حل کرنے کا ہے۔ کوئی بھی ادارہ اسے حل نہیں کرسکتا تا آنکہ شہریوں کی جانب سے اعلیٰ معیار کے لیے بھرپور دباؤ اور تعاون حاصل نہ ہو۔ شہر کے حسن اور اس کے معیار کو اتنی اہمیت دینی چاہیے کہ کسی بدذوقی اور بیہودگی کی گنجائش نہ رہے۔ اکا دکا عمل سے یہ مسئلہ اور بھی الجھتا جاتا ہے۔ کبھی کسی چوک کے درمیان گھاس کا چھوٹا سا پارک بنانے کے لئے اکھاڑ پچھاڑ ہوتی ہے کہیں میونسپل کارپوریشن کا عملہ تہ بازاری اور ان کا بدنام ٹرک ناجائز تجاوزات کو ہٹانے کے لیے حملہ آور ہوتا ہے کبھی سینما ہاؤس کے عریاں پوسٹر پولیس کو شاق گزرتے ہیں تو کبھی کوئی بے قصور درخت اس جرم کی سزا میں کاٹ دیا جاتا ہے کہ ٹریفک کو روکتا ہے۔ کوئی سڑک درمیان میں توڑی جارہی ہے تاکہ بجلی، ٹیلی فون، پانی اور سوئی گیس کی لائن کو ڈھونڈا جاسکے، فٹ پاتھ کے کنارے صرف اس لیے رنگے جاتے ہیں کہ غیرملکی مہمان جب یہاں سے گزریں تو بدنما نہ معلوم نہ ہوں۔ رنگا رنگ جھنڈیاں، چھڑکاؤ اور قناطیں شامیانے بھی اسی ''فٹافٹ بیوٹی پلان'' میں شامل ہیں جو محکمہ پولیس کے ذمے ہوتا ہے۔ باقی رہیں شہر کی گلیاں اور وہ علاقے جو عرف عام میں بدنصیب علاقے کہلاتے ہیں تو وہ توجہ کے مستحق اس لیے نہیں ہیں کہ شہریوں کا ذاتی مسئلہ ہیں۔ باہر سے آنے والوں کی سرگرمیاں مال روڈ اور اسی کے آس پاس ہی تو محدود ہیں۔ چنانچہ مال روڈ یا شاہراہ قائداعظم کا معیار بہت اونچا نہ ہونے کی باوجود بھی شہر کے دوسرے علاقوں کے خوبصورتی اور صفائی کے معیار سے بلند ہے۔ یہ کام اس انداز سے ہورہا ہے کہ خوش نصیب اور بدنصیب علاقوں کی تمیز بخوبی کی جاسکے۔

شہر کی خوبصورتی کے ذمہ دار ادارے کوشش ضرور کرتے ہیں کہ شہر میں کوئی خوبصورت اضافہ کریں لیکن یہ کوشش اس لیے بارآور ثابت نہیں ہوتی کہ بصری ماحول کو جانچنے اور تخلیق کرنے والے ماہرین کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ ان کوششوں میں ہم آہنگی نہیں ہوتی اور ان کوششوں کے مقصد کا بھی کوئی واضح تصور ہمارے پاس نہیں۔ بصری ماحول ماہرین کی خدمت حاصل کرنا مشکل نہیں۔ ایسے ماہرین کی ایک کھیپ تیار ہوچکی ہے جنہوں نے لاہور ہی میں آنکھ کھولی اور اس کے ماحول کو سمجھتے اور سیکھتے ہوئے

اپنے فنون میں تربیت اور تعلیم حاصل کی ان میں مختلف انداز وفکر اور مختلف تکنیک اپنائے ہوئے ماہرین اور فن کار ہیں یہ ہمارے ماہرین فن تعمیر، مصور، مجسمہ ساز، ماہرین شہری منصوبہ بندی اور ماہرین باغبانی وغیرہ ہیں۔ لاہور اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ شروع ہی سے فنکاروں کی آماجگاہ اور جائے سکونت بنا رہا ہے۔ فنکار چاہے باہر سے آئے ہوئے ہوں یا اس سرزمین کی پیدائش، شہر کی خوبصورتی کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ان کی انفرادی اور اجتماعی کوششوں سے شہر کو دلکش اور حسین تر بنایا جا سکتا ہے۔ لاہور ابھی تک سیاحوں میں مقبول ہے تو اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ماضی میں ہمارے فن کاروں کی اس آرزو کو دبایا نہیں گیا بلکہ اس کی قدر کی گئی اور شہر کو ان کی امانت سمجھ کر انہیں سونپا گیا۔ آج بھی ان فنکاروں اور ان کے قدر دانوں کی یادگار تاریخی عمارتیں، باغ اور بازار ہمارے اور ہمارے مہمانوں کے لئے کشش اور دلچسپی کا باعث ہیں۔ بادشاہی مسجد ہو یا شالامار باغ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ لاہور ایک خوبصورت اور رنگا رنگ شہر ہے اور اس کے باشندے فن کی قدر کرتے ہیں۔ ان کا ذوق بلند ہے اور یہاں کے فن کاروں معماروں اور کاری گروں نے اسے دنیا کے حسین ترین شہروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اسی طرح وینس میں ہوا۔ اسی طرح اصفہان اور پیرس میں ہوا۔ شہر ایک زندہ اور پائندہ فن پارہ بن گئے۔ لاہور میں اس حسن کو پائیداری نصیب نہ ہو سکی۔ سیاسی خلفشار اور ذہنی وجسمانی غلامی نے بہت کچھ تباہ ہونے دیا۔ جو باقی بچا وہ جلد بازی اور غلط منصوبہ بندی کی نذر ہو گیا۔ لاہور میں انگریزوں کی تعمیرات اور شہری منصوبہ بندی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مستقبل کا بہت کم خیال رکھا گیا ہے۔ آج جب طرح طرح کے مسائل نے جنم لیا تو ان میں ردوبدل بددلی سے کی گئی۔ اس وقت بھی ماہرین سے مشورہ حاصل کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ چنانچہ لاہور کی سڑکیں چوک گلیاں بازار جو منظر پیش کرتے ہیں وہ خود اس حقیقت کا اظہار بن گئے ہیں کہ کسی چیز کی کمی ضرور ہے اور کسی جگہ کوئی خرابی موجود ہے۔ یہ کمی اس ذوق نظر اور جمالیاتی حس کا فقدان ہے جو کسی معاشرے میں فنکار کے وجود کو صحیح اور ضروری ثابت کرتی ہے۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے اشتہاری تختے، بجلی کے کھمبے، ٹریفک کے اشارے، درخت، عمارات، باغ، کھیل کے میدان، فٹ پاتھ، عبادت گاہیں، تعلیم، صحت، تفریح اور کاروبار کے لئے مخصوص کی گئی جگہوں، نہروں اور فواروں غرض ہر جگہ ذوق نظر کی کمی کی شکایت ہے۔

لاہور کے شہری بے شک اس صلاحیت کے مالک ہیں جو شہر کو خوبصورت سے خوبصورت تر بنانے کے لئے ضروری ہے۔ یہ صلاحیت اپنے شہر سے بے پناہ محبت اور اس کو پھیلتے پھولتے دیکھنے کی

آرزو ہے۔ ٹریفک اور ضروریات کی فراہمی کے نظام اپنی جگہ بہت سے مسائل سے دوچار ہے اور ان مسائل کی شدت بھی لاہور کے شہریوں کے لئے ایک عذابِ جان ہے لیکن شہر کی موجودہ دگرگوں حالت اور بدنمائی یہاں کے رہنے والوں کے لئے سوہان روح ہے۔ ان کی روایتی اور تاریخی حس جمالیات بری طرح مجروح ہوئی ہے اور وہ ایسے ماحول میں رہنے کے لئے مجبور ہیں جو ان کے لئے بدنامی اور رسوائی کا موجب ہے۔ سیاح جو بڑے چاؤ سے لاہور دیکھنے اور اس سے لطف اٹھانے یہاں آتا ہے جب ٹوٹے ہوئے فٹ پاتھ، گندگی کے ڈھیر، سڑاند اٹھتے ہوئے چھپڑ، جھولتے ہوئے بیہودہ سائن بورڈ اور کھنڈر نما عمارتیں دیکھتا ہے تو حیران پریشان رہ جاتا ہے کہ یہ وہ افسانوی شہر تو نہیں ہوسکتا جہاں فضا میں باغوں سے آنے والی بہار کی مہک ہے جہاں انارکلی اور نور جہاں دفن ہیں اور جہاں اس برصغیر کے عظیم حسن ساز اور حسن شناس پیدا ہوتے رہے ہیں نہ یہاں وہ پاکیزگی ہے جو داتا کی نگری کا خاصا ہونی چاہیے نہ یہاں وہ رنگینی ہے جو جہانگیر جیسے مصور کے محبوب شہر میں پائی جانی چاہیے۔ جو کچھ نظر آتا ہے وہ کسی بھی بے لگام شہر میں مل سکتا ہے۔ یہاں کا گرد و غبار، شکست و ریخت اور غیر آہنگی کسی صورت بھی قابل ستائش نہیں۔

اس جگہ یہ بیان کرنا مناسب ہوگا کہ شہری زندگی کے اس پہلو کو نظر انداز کرنے سے صرف جمالیاتی سطح پر ہی نقصان نہیں بلکہ بہت سے معاشی اور معاشرتی مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں۔ شہر کی خوبصورتی یقیناً اس کے اقتصادی وجود کے لئے موثر ثابت ہوتی ہے۔ سیاحوں کے لئے مزید کشش رکھنے سے شہر کو سرمایہ میسر آسکتا ہے۔ شہر کی کاروباری زندگی میں رونق اور گہما گہمی آسکتی ہے اور سرمایہ کاری کے امکانات بڑھ سکتے ہیں۔ لاہور جیسے بڑے شہر کے لئے ماسٹر پلان تیار کرنا ایک ضروری مرحلہ تھا، یہ وہ لائحہ عمل ہے جس کے ذریعے مستقبل میں شہر کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کام کرنا ہے۔ مرحلے کو طے کرنے کے لئے حکومت نے کچھ کام کیا ہے لیکن ان سفارشات اور مشوروں پر عمل کرنے کا وقت ابھی تک نہیں آیا۔ (1970ء) لاہور کارپوریشن، لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ اور محکمہ پولیس اپنی اپنی جگہ کام کرتے ہیں لیکن ان کوششوں کو خوش آئند سمجھنا ممکن نہیں جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ ان کا مقصد کس لائحہ عمل کے تحت ہے۔ ابھی تک یہی ہوتا ہے کہ کوئی منصوبہ جو ظاہری طور پر لاہور کی خوبصورتی میں اضافہ کے لئے مندرجہ بالا اداروں میں سے کوئی ایک شروع کرتا ہے، دیگر وجوہات کی بنا کر دوسرا ادارہ ناپسند کرتا ہے اور اس سے کئی اور مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ عوامی ذہن ابھی تک لاہور کو ایک خوبصورت شہر دیکھنے کی آرزو میں ہے چنانچہ جہاں کہیں موقع ملا ہے اس عوامی اور لوک طرز کا اظہار ہوا ہے جو لاہور کا خاصا

ہے۔ایسے مقامات جہاں بڑے بڑے اداروں کا زیادہ عمل دخل نہیں ابھی تک اپنا رنگ اور دلکشی بچائے ہوئے ہیں لیکن انہیں محفوظ رکھنے کی کوئی گارنٹی نہیں دی جا سکتی۔ ہوسکتا ہے آج جس جگہ آپ کی پسندیدہ سجی سجائی پھولوں کی دکان یا کوئی خوبصورت سا پارک ہے کل کو وہاں ایک ٹیکسی سٹینڈ بن چکا ہو۔ کسی بھی سونی سونی خاموش اور پرسکون ٹھنڈی سڑک کا تمام حسن ختم کیا جا سکتا ہے اور اس جگہ ساتھ ساتھ بہت سے سنیما ہال بنائے جا سکتے ہیں۔ضرورت کے تحت تبدیلیاں لازمی ہیں لیکن مسئلہ وہی ہے کسی منصوبے کی عدم موجودگی سے یہ ترقیاتی سرگرمیاں غیر یقینی صورت حال پیدا کریں گی اور ان کے اثرات مستقبل میں کہیں زیادہ نقصان دہ ثابت ہوں گے۔لاہور کو تاریخی اور ثقافتی اہمیت کے پیش نظر پاکستان میں ایک نمونے کے شہر کا کردار ادا کرنا چاہیے۔اس ذمہ داری پر پورا اترنے کے لئے ضرورت ہے کہ ماہرین کو نظر انداز نہ کیا جائے اور شہر کی خوبصورتی اور دلکشی میں اضافے کے لئے جلد از جلد منصوبہ بنایا جائے۔لاہور کے شہری بالعموم اور لاہور کے فن کار بالخصوص اس کا خیر مقدم کریں گے۔

O

لاہور میں رہائش کا مسئلہ

لاہور قیام پاکستان سے پہلے اور بعد برصغیر پاک وہند کا ایک اہم شہر رہا ہے۔لاہور کی سیاسی، اقتصادی، صنعتی تعلیمی اور ثقافتی اہمیت کے پیش نظر آبادی میں اضافہ اور رہائشی سہولیات کی کمی ہمیشہ سے ایک مسئلہ رہی ہے۔آزادی کے بعد گزشتہ ستائیس سال میں (1970ء) لاہور، پاکستان کا سب سے بڑا تعلیمی، ثقافتی اور فلمی مرکز بن گیا ہے۔مہاجرین کی آمد اور گردونواح کے دیہات اور شہروں سے آبادی کی نقل مکانی سے لاہور میں رہائشی سہولتوں کی قلت ایک سنگین حقیقت بن گئی ہے۔وحدت مغربی پاکستان سے بھی لاہور آبادی کے لحاظ سے بسرعت ترقی پذیر ہے۔ ریلوے ہیڈ کوارٹرز، بہت سے عظیم صنعتی منصوبے اور شہرہ آفاق تعلیمی ادارے آبادی کے لئے کشش کا باعث بنے۔ پاکستان کے وسطی اور شمالی علاقے کی تجارت بھی بڑی حد تک لاہور سے تعلق رکھتی ہے۔

ان تمام حقائق سے یہ پتا چلتا ہے کہ لاہور میں ایک عظیم تر شہر بن جانے کی پوری صلاحیت ہے۔لاہور کی ترقی اور وسعت سے رہائش کا مسئلہ روز بہ روز مشکل ہوتا جا رہا ہے۔اس سلسلے میں دو پہلو قابل غور ہیں اول یہ کہ لاہور میں رہنے والے تقریباً اٹھارہ لاکھ (1970ء) شہریوں کو کسی نہ کسی طرح سر چھپانے کی جگہ مہیا کرنا اور دوئم یہ کہ موجودہ رہائشی سہولیات کو معیاری اور حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق بنانا۔ جہاں تک پہلے پہلو کا تعلق ہے، لاہور کی بیشتر آبادی شہر کے قدیمی محلوں میں رہ رہی ہے جو قیام پاکستان سے پہلے آباد ہونے شروع ہوئے تھے۔ان محلوں میں نئی تعمیرات کی بہت کم گنجائش باقی رہ گئی ہے۔ دوسری جانب قیام پاکستان کے بعد مہاجرین اور روزگار تلاش کرنے کے لئے آئے ہوئے دیہاتی اور شہری باشندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے شہر کی اردگرد متعدد نئی رہائشی آبادیاں معرض وجود میں آ گئی ہیں۔ان تمام حقائق کے باوجود لاہور میں ابھی تک تقریباً پچاس ہزار گھرانے جھگیوں میں رہ رہے ہیں۔ (1970ء) دوسرے پہلو کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ لاہور میں موجود رہائشی سہولتوں کا

18.66 فیصد حصہ آئندہ بیس سال تک انسانی رہائش کے لئے موزوں نہیں رہے گا اوران عمارات کی عمر کبھی کی ختم ہو چکی ہے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنے والے بیس سالوں میں لاہور کے لئے بالکل نئے رہائشی بندوبست اور نظام کی ضرورت ہے۔ اس وسیع اور دقت طلب کام کے لئے ہمہ جہتی کوششوں کی ضرورت ہے۔حکومت اورعوام کے باہمی تعاون اورمدد کے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔

ابھی تک رہائشی سہولتوں کے لئے لاہور میں جو نظام رائج ہے وہ دوقسم کی آبادیوں پر مشتمل ہے۔ایک طرف وہ آبادیاں ہیں جولاہور کارپوریشن کی حدود میں کسی خاص سکیم یا منصوبے کے بغیر آباد ہوتی چلی گئی ہیں۔دوسری قسم کی آبادیاں زیادہ تر لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ کے رہائشی منصوبے ہیں جو ایک خاص طبقے کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ان آبادیوں میں مکانات کی تعمیر کے لئے پلاٹ نیلام کیے گئے ہیں اور سڑکیں، آب رسانی، پانی کے نکاس اور دیگر ضروریات کے لئے امپرومنٹ ٹرسٹ نے انتظامات کیے ہیں۔اس قسم کی آبادیوں میں سمن آباد، گلبرگ، شادباغ، شادمان کالونی، شاہ جمال کالونی، نیو مسلم ٹاؤن، گارڈن ٹاؤن وغیرہ کی نئی بستیاں شامل ہیں۔آج کل ان بستیوں میں نئی عمارات تعمیر کی جارہی ہیں (1970ء) اور متوسط طبقہ یعنی 500 سے 1000 روپے ماہانہ کمانے والے گھرانوں کے لئے ان بستیوں میں بہت کشش ہے۔ نچلے طبقے کے لئے عمارات میں لگائی جانے والی یکمشت رقم کا حصول مشکل ہے چنانچہ ذاتی تعمیرات کے لئے تعداد کے لحاظ سے اہم یہی متوسط طبقہ ہے۔ اس طبقے کی سماجی واقتصادی حالت کے پیش نظر یہ بات نہایت اہم ہے کہ جدید طرز زندگی اور آسائش و آرائش کے لئے کم سے کم خرچ میں ایسی عمارات تعمیر کی جائیں جو مستقبل کی ضروریات بطریق احسن پوری کرسکیں۔حکومت کے تعمیر کردہ کوارٹرز اور دیگر رہائشی عمارات کے برعکس ان مکانوں میں انفرادی پسند اور ضرورت کو بڑا دخل ہے۔لاہور کے تقریباً تمام علاقوں میں کسی نہ کسی طرح کے تعمیراتی قانون لاگو ہیں مثلاً لاہور کارپوریشن بلڈنگ بائی لاز اور گلبرگ، شادمان یا مسلم ٹاؤن وغیرہ کے لئے لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ کے بائی لاکوڈز۔ان قوانین کی پابندی ضروری ہے تاکہ عمارات کے تحفظ، پاکیزگی اور حفظان صحت کے اصولوں کا خیال رکھا جاسکے چنانچہ یہ قدر مشترک ان آبادیوں کو کچھ مشترکہ تاثر دے سکتی ہے۔متوسط طبقے کے لئے مکانات کی تعمیر کا موجودہ طریقہ کچھ اس طرح ہے:

1۔زمین کا حصول: اس میں نیلام الاٹمنٹ یا تبادلہ زمین شامل ہیں۔نئی آبادیوں میں عموماً نیلام عمل میں آتا ہے اور زمین کے قطعات جائے وقوع، اونچائی اور شکل کے لحاظ سے مختلف قیمتوں پر

فروخت کردیئے جاتے ہیں۔ زمین کے ان قطعات کی شکل عموماً مستطیل ہوتی ہے اور چھوٹا ضلع سڑک یا گلی سے ملحق ہوتا ہے۔

2۔ ڈیزائن: اس کے بعد مکان کے مجوزہ نقشے کے انتخاب کا مرحلہ آتا ہے۔ لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ نے تربیت یافتہ ماہرین فن تعمیر یعنی Architects کے بنائے ہوئے نقشے منظور کرنے کی پالیسی اختیار کی ہے لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ لاہور میں ان ماہرین کے فن سے بہت کم فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ لاہور میں نوے فیصد نئی عمارات غیر تربیت یافتہ لوگوں کی اختراعات ہیں۔ رہائشی عمارات کی ترتیب ایک نہایت پیچیدہ اور سائنسی کام ہے۔ لاعلمی اور بے پروائی سے کام کرنے کی صورت میں ان عمارات میں آسائش اور اقتصادی فائدے پس پشت رہ جاتے ہیں۔ لاہور میں آرام دہ اور خوبصورت مکانات کی تعمیر اس وقت تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتی جب تک عوام کو ماہرین فن تعمیر کی ضرورت کا احساس نہ پیدا ہو۔ اس جگہ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ماہرین کی کمی (پاکستان میں آبادی کے لحاظ سے ماہرین فن تعمیر کی شرح دنیا کے ممالک میں سب سے کم ہے) بھی عمارات کے غیر تسلی بخش ہونے کا ایک سبب ہے۔ اس کمی نے بہت سے نااہل لوگوں کو کاروبار کا موقع دے دیا ہے۔ حکومت کی عمارات کے لئے یہ کمی ماہرین فن تعمیر کو ملازمت دے کر کسی حد تک پوری کی جاسکتی ہے لیکن عوام کے لیے اس فن کا استعمال اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کی ضرورت کو محسوس کیا جانے لگے۔ رہائشی سہولتوں کی تعمیر کے سلسلے میں سب سے بڑی خواہش خوبصورتی اور آسائش خیال کی جاتی ہے۔ ان دونوں امور کا حصول فن تعمیر کے ماہرین اور مالک مکان کے تعاون سے ممکن ہے۔ انفرادی پسند اور جدت کے ساتھ ساتھ موسمی اثرات، سماجی حالات اور لاگت کے مسائل بھی فن تعمیر کے احاطے میں آتے ہیں چنانچہ متوسط طبقے کے لئے رہائشی ڈیزائن تیار کرنے کے لئے ماہرین کو ان سب باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

3۔ تعمیر: نقشے کے منظور ہوجانے پر عمارت کی تعمیر کا مرحلہ آتا ہے۔ عموماً یہ کام ٹھیکہ پر کرایا جاتا ہے۔ لاہور میں استعمال ہونے والے مقبول تعمیراتی سامان میں اینٹ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ عمارتی لکڑی، سیمنٹ، بجری، ریت، رنگ و روغن، فولاد، عمارتی تنصیبات اور دیگر ساز و سامان جس کی تعمیر میں ضرورت پیش آتی ہے۔ لاہور کی مارکیٹ میں باآسانی مل جاتا ہے۔ اچھے ڈیزائن کی بدولت اس ضمن میں لاگت بچائی جاسکتی ہے۔ ماہرین فن تعمیر کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ تعمیر کے معیار اور ٹھیکیدار کے کام کی نگرانی کریں تاکہ عمارت کی پائیداری اور مضبوطی کی ضمانت دی جاسکے۔ تعمیر کے لئے صحیح موسم کا انتخاب

بھی اس کی پختگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر ایک اچھی ڈیزائن کی ہوئی عمارت کی مکمل لاگت ہماری روایتی عمارات کے مقابلے میں بے حد کم آتی ہے۔ متوسط طبقے کی رہائشی ضروریات میں ترقی کرتے ہوئے معاشرے کی جھلک ملتی ہے۔ اس طبقے کے لئے خوب سے خوب تر کی تلاش کسی بھی ڈیزائن کو آخری ڈیزائن کو قرار نہیں دینے دے گی چنانچہ تعمیر میں ردوبدل کا تھوڑا سا پہلو ضرور رکھنا چاہیے۔

4۔ رہائش: اس مرحلے میں تعمیر کے بعد آخری صفائی اور پھر زیبائش و آرائش کے کام ہیں۔ فرنیچر اور پردے، ضروریات زندگی، باغیچے، لان اور کھیل کی جگہ مہیا کرنا بھی اسی مرحلے میں شامل ہے۔

اس کے بعد ایک متوسط طبقے کا گھرانہ اپنے نئے گھر میں خوشی خوشی داخل ہوتا ہے اور خوش قسمتی سے یہ گھر آرام دہ بھی ہے تو ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ مکان کی مرمت، ٹیکس اور دیگر دائمی اخراجات اس تعمیری لاگت کے علاوہ ہیں۔ ان میں سے مرمت کا خرچ اچھے ڈیزائن کی بدولت کم ہو سکتا ہے۔ یہی صورت بجلی کے بل کی ہے جسے اچھی روشنی اور اچھی موسمی کیفیت والے کمروں کی بدولت کم کیا جا سکتا ہے۔ متوسط طبقے کو بالخصوص توجہ دینے کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہی وہ طبقہ ہے جسے حکومت کے بنائے ہوئے کوارٹرز میں رہنا پسند نہیں۔ بڑے بڑے علاقوں میں خود کفیل گھر یہ بنا نہیں سکتے لہٰذا ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ یہ حکومت کے مہیا کیے ہوئے پلاٹ پر اپنی پسند کی تعمیر کرائیں۔ اس میں ان کے لئے بے شمار پریشانیاں اور مشکلات ہیں۔ ماہر فن تعمیر کا فائدہ اٹھانے کی ابھی تک کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی جو کہ ان مشکلات کے حل میں معاون ہو سکتا ہے۔

ذیل میں ایک ایسے مکان کی ترتیب اور اس کی تفصیل ہے جو کہ ایک معیاری متوسط طبقے کے گھرانے کے لئے بنایا جا سکتا ہے۔ اس میں موسمی اثرات سے بچاؤ، متوسط طبقے کی سماجی و گھریلو ضروریات، کم سے کم لاگت، جدید طرز تعمیر اور پاکستان کی روایات کا خیال رکھا گیا ہے۔ مکان میں ضرورت کے لحاظ سے تبدیلی کی بھی گنجائش ہے۔ اس مکان کی ترتیب سے پہلے ماہرین عمرانیات کے مشورے کے بعد یہ سمجھا گیا ہے کہ لاہور کا ایک اوسط متوسط گھرانہ چار سے پانچ افراد پر مشتمل ہے۔ ایک اضافی فرد کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے چنانچہ یہ مکان مندرجہ ذیل گھرانوں کے لئے کارآمد ہے۔

1۔ ایک ایسا گھرانہ جس میں چار افراد ہیں:

صاحب خانہ، بیگم، دو بچے، ایک ملازم کی رہائش کا بندوبست ہے۔

2۔ ایک ایسا گھرانہ جس میں پانچ افراد ہیں:

صاحب، بیگم، دو چھوٹے بچے، ایک نوجوان لڑکا، ایک ملازم کی رہائش کا بندوبست ہے۔

3۔ ایک ایسا گھرانہ جس میں چھ افراد ہیں:

صاحب خانہ، بیگم، چار بچے اور ایک ملازم کی رہائش کا بھی بندوبست ہے۔

4۔ ایک ایسا گھرانہ جس میں چھ افراد ہیں:

صاحب خانہ اور بیگم، دو بچے، ایک نوجوان لڑکا، ایک بزرگ۔

5۔ ایک ایسا گھرانہ جس میں چار افراد ہیں:

صاحب خانہ، بیگم، ایک بچہ، ایک ملازم کی رہائش کا بھی بندوبست ہے۔ ایک بزرگ بھی رہ سکتے ہیں۔

6۔ ایک ایسا گھرانہ جس میں تین افراد ہیں:

صاحب خانہ، بیگم اور ایک بزرگ، ایک مہمان اور ایک ملازم کے لیے بھی بندوبست ہے۔

اس کے علاوہ اور کئی طرح سے اس مکان کو ضرورت کے لحاظ سے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مکان کے لئے کسی خاص ساز و سامان کی ضرورت نہیں بلکہ آسانی سے دستیاب ہو جانے والے عمارتی سامان سے تعمیر کرایا جا سکتا ہے۔ اس میں تعمیر ہونے والی عمارت کو جانچتے وقت ایک خاص طبقہ کی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔

عمارت کی زمینی منزل (Ground Floor) کا نقشہ ایک خاص ترتیب سے بنایا گیا ہے اور عمارت کے دو حصوں کے درمیان کھلی جگہ ہے۔ کار کھڑی کرنے کی جگہ کے ساتھ ہی داخلہ ہے جس کے ایک سرے پر موٹر کے اوزار اور پرزوں کے علاوہ باغبانی میں کام آنے والے آلات کے لئے جگہ بنی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بجلی کے مین بورڈ اور سوئچ نصب ہوں گے۔

اس جگہ سے آگے جانے کے لئے تین راستے ہیں۔ دائیں جانب ایک دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا ہے جو مہمانوں سے ملاقات اور دیگر رسمی کاموں کے لئے ہے۔ دوسرا دروازہ گھریلو علاقے میں کھلتا ہے۔ یہ ہال کمرہ یا لاؤنج ہے جہاں دن بھر رونق رہتی ہے۔ اٹھنے بیٹھنے، کھیلنے، پڑھنے اور تفریح کے لیے یہ جگہ مناسب ہے، یہاں سے گھر کے باقی کمروں میں بغیر کسی واسطے کے جایا جا سکتا ہے۔ داخلہ سے ایک راستہ اوپر کو جاتا ہے جو ایک کمرے کے دروازے پر ختم ہوتا ہے۔ مہمان کو وہاں لے جایا جا سکتا ہے۔ راستے میں (Glazed Passsage) سے گزرتے وقت اردگرد کے باغیچہ کا منظر دلکش اور خوبصورت ہو

گا۔ کھانے کے کمرے میں آٹھ نشستوں کی گنجائش ہے جو خاص مواقع پر زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی باورچی خانہ ہے جس میں سٹور کرنے کے لئے خاصی گنجائش موجود ہے۔ باورچی خانہ میں سے ایک دروازہ ملازم کے کمرہ میں کھلتا ہے جو کسی دیگر فرد خانہ کے کام بھی آ سکتا ہے۔

عمارت کی پہلی منزل کے لئے ہال کمرے میں سے آنا پڑے گا۔ زینہ چڑھ کر ایک راہداری (Corridor) آتی ہے جس میں سے ایک دروازہ صاحب خانہ کی خواب گاہ میں جاتا ہے۔ یہ کمرہ خاصا وسیع ہے۔ پڑھنے لکھنے کے لئے بھی معقول انتظام ہے بلکہ کتابوں کی چھوٹی سی لائبریری بھی اس میں سما سکتی ہے۔ ملحقہ لباس خانہ اور غسل خانہ میں کپڑوں کے رکھنے اور پہننے کے انتظامات ہیں۔ ایک دروازہ صندوق خانہ میں کھلتا ہے جہاں بہت سی ضروری چیزیں رکھی جا سکتی ہیں۔ راہداری بذات خود نہایت کارآمد جگہ ہے اور یہاں پڑھنے لکھنے کے لئے کافی جگہ ہے۔ اس کے علاوہ سلائی، بات چیت، کھیل اور دیگر مشاغل کے لئے بھی یہ جگہ غنیمت ہے۔ ایک دروازہ بچوں کے کمرے میں جاتا ہے۔ یہاں دو بچوں کی رہائش کا بندوبست ہے۔ ایک بڑے بچے کے لئے بھی یہ جگہ استعمال ہو سکتی ہے۔ اس کمرے میں پڑھنے لکھنے کے لیے اور چیزیں رکھنے کے لئے جگہ ہے۔ راہداری سے متصل ایک غسل خانہ ہے جسے یہ بچے استعمال کر سکتے ہیں۔ اوپر کی منزل کا باقی حصہ کھلا صحن ہے جو گرمیوں میں خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوگا۔ اس میں بھی دو تین طرح کی جگہوں کا انتخاب ممکن ہے۔ ملازم کے کمرے سے اوپر آنے کے لیے الگ انتظام ہے اور اس کے لئے الگ صحن دیا گیا ہے۔ باقی ماندہ صحن کی باپردگی اس صحن سے متاثر نہیں ہوتی۔ ایک برساتی بھی دی گئی ہے تاکہ بارشوں میں بچاؤ ہو سکے۔ یہ جگہ برآمدہ کے طور پر بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ سال کے ایسے دنوں میں جب کھلی ہوا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے یہ جگہ نعمت ثابت ہوتی ہے۔

یہ اس عمارت کا مختصر سا خاکہ ہے۔ اس کے متعلق چند باتیں اور قابل غور ہیں مثلاً اسے موسمی اثرات سے بچاؤ کے لحاظ سے یوں بنانا چاہیے کہ کار مشرق سے داخل ہو اس طرح کئی فائدے ہیں ایک تو یہ کہ تمام خواب گاہوں کی کھڑکیاں مشرق کی جانب کھلتی ہیں اور کمرے نسبتاً ٹھنڈے رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مغرب اور جنوب کی جانب وہ تمام ممکن جگہیں جہاں دن بھر زیادہ گرمی رہتی ہے اور جہاں سورج کی شعاعیں براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں کوئی دروازہ یا کھڑکی نہ ہونے وجہ سے گرمی سے مدافعت کا ذریعہ ہوگا۔

غسل خانوں کی کھڑکیاں اس جانب کی گئی ہیں تا کہ یہ جگہ نمی اور جراثیم سے محفوظ رہے۔اس مکان کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اسے پاکستان کے موسموں کے لئے بنایا گیا ہے اور یہ سہولت رکھی گئی ہے کہ ہر ایک کمرہ پوری طرح سے کار آمد ہے۔لاہور میں سال کے کچھ حصے ایسے ہوتے ہیں جب کمرے کے اندر بند رہنا ظلم ہے۔اچھی طرح سے بنائے ہوئے مکانات میں یہ خوبی ہونی چاہیے کہ وہ بدلتے ہوئے موسم کے ساتھ بدلتے رہیں۔آپ دیکھیں گے کہ یہ مکان مختلف موسموں میں کس طرح استعمال ہوگا۔

1-**ڈرائنگ روم:** یہ سال کے ان حصوں میں جب اندرون خانہ رہنا مشکل اور تکلیف دہ ہے۔ باہر بھی لایا جا سکتا ہے۔ڈرائنگ روم کے مغرب میں چھوٹا سا باغیچہ ایک سجا سجایا ہوادار اور الگ تھلگ ڈرائنگ روم ہے جہاں کار پارک کرنے کے بعد آیا جاسکتا ہے۔

2-**ہال کمرہ:** ہال کمرے کے مغرب میں عمارت کے درمیان بچوں کے لئے باغیچہ اور صحن ہے جسے ان کاموں میں استعمال کیا جاسکتا ہے جو ہال کمرے کے لئے مخصوص کیے گئے ہیں۔

3-**بیٹے کے کمرہ:** بیٹے کے کمرے کے سامنے ایک گھرا ہوا صحن ہے جو استعمال کیا جاسکتا ہے۔

4-**صاحب خانہ کی خواب گاہ:** اوپر کی منزل میں صاحب خانہ کی خواب گاہ کے سامنے چھت ہے جسے آرام کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

5-**بچوں کی خواب گاہ:** بچوں کے لئے کھانے کے کمرے کی چھت پر ایک کھلی خواب گاہ ہے جسے وہ استعمال کر سکتے ہیں۔

6-**ملازم کا کمرہ:** ملازم کے کمرے سے اوپر جانے کے لئے راستہ ہے۔یہاں سے وہ چھت پر واقع کھلے صحن کو خواب گاہ کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔

7- **کھانے کا کمرہ اور باورچی خانہ:** عمارت کے درمیان واقع صحن کو ان دونوں مقاصد کے لیے عارضی طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ مکاں موسم سے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتا رہے گا اور اس طرح زیادہ آرام دہ اور منعفت بخش رہے گا۔دوسری جانب اس مکان کو بڑی آسانی سے ایئر کنڈیشن بھی کرایا جا سکتا ہے۔ایئر کنڈیشن کرانے میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔اس وقت جبکہ دیگر مکانات اپنے ڈیزائن اور وسعت کی وجہ سے اس کام میں رکاوٹ اور مجبوری بنیں گے،اس مکان میں کوئی

ایسی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ زینے کے اوپر پانی ذخیرہ کرنے کے لیے ایک چھوٹے سے ذخیرے کا بھی انتظام ہے، جس سے پانی کی مسلسل فراہمی بھی ممکن ہے۔ عمارت کی ظاہری خوبصورتی اور جمالیاتی پہلو پر بھی نظر رکھی گئی ہے۔

فن تعمیر بنیادی طور پر فنون لطیفہ کی ایک اہم شاخ ہے۔ چنانچہ ہر تخلیق میں مندرجہ بالا پہلوؤں پر بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ اس عمارت میں رنگ، تناسب، تسلسل اور حجم کے متعلق خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس کے سامنے کے حصے کا نقشہ اور سڑک سے آنے کا حصہ اس انداز سے بنائے گئے ہیں کہ عمارت میں دل کشی پیدا ہوا۔ سفید اور سرمئی کے علاوہ اس میں شوخ رنگ بھی استعمال کیے گئے ہیں مثلاً برساتی کی دیوار پر سرخ رنگ ہے۔ اسی طرح سیڑھیوں کے لئے گول جگہ کی بیرونی سطح پر خاکی پتھر لگایا گیا ہے۔ دیواروں کو انفرادی پسند اور جائے وقوع کے لحاظ سے کئی طرح سے دلچسپ بنایا جا سکتا ہے۔ فن تعمیر ابتدا ہی سے فنون لطیفہ کی ایک قسم شمار ہوتا آیا ہے اور نئے زمانے کی ذہنی وفکری ترقی کے ساتھ ساتھ عمارتی ذوق نے بھی روپ بدلے ہیں چنانچہ آج آرام دہ خوبصورت اور فنکارانہ تخلیل کی حامل رہائشی عمارات کے ذریعے موجودہ خیالات، تحریکات، ضروریات اور مسائل سمجھا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور میں رہائشی عمارات اس فن کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔

○

سستے اور آرام دہ مکان کی تعمیر

ہمارے یہاں یہ شکایت عام ہے کہ نئے منصوبے ترتیب دیئے جانے میں ملک کی معاشرتی اقتصادی اور جغرافیائی ضروریات کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ پاکستان کے لوگ مغربی طرز زندگی کو پوری طرح نہ اپنا سکے ہیں اور نہ آئندہ اسے اپنا سکیں گے۔ چنانچہ وہ چیزیں جو یورپ اور امریکہ و جاپان یا کسی اور ترقی یافتہ معاشرے میں از حد کارآمد اور مناسب نظر آتی ہیں پاکستان کے مخصوص حالات میں اپنی افادیت کھو دیتی ہیں۔ اشیائے صرف، ملبوسات، مشینیں، عمارات، طرز بود و باش سب کچھ اسی ضمن میں آتا ہے۔ فنون لطیفہ کی مختلف شاخوں میں مغربی امثال کی نقل یا اثر اندازی دیکھی جا سکتی ہے۔ بعض صورتوں میں یہ چیزیں ہمارے ماحول میں بڑی اچھی طرح کھپ جاتی ہے لیکن کبھی کبھی یہ مسائل کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔ ماہرین کی ایک بڑی تعداد مغربی افکار کے تحت اپنی تربیت اور اظہارِ فن کے لئے ان ترقی یافتہ معاشروں سے متاثر ہے۔ چھوٹے چھوٹے کاموں اور چیزوں سے پیدا شدہ مسائل آسانی سے حل کیے جا سکتے ہیں لیکن منصوبہ بندی کے وقت غلط اندازے اور فیصلے دور رس نتائج رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعے کسی نظام کا کلی یا جزوی طور پر ناکام ہونا عین ممکن ہے۔ مغربی معاشرے کی بہت سی ترجیحات ہمارے یہاں سے قطعاً مختلف ہیں اور انہیں کسی طرح بھی پاکستانی عوام کے لئے اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی سلسلے میں ایک مثال فن تعمیر ہے۔ یہ فیصلہ مشکل ہے کہ مغربی طرز تعمیر نے کہاں کہاں اور کس طرح پاکستان کے ماہرین فن تعمیر کو متاثر کیا ہے لیکن یہ کہنا درست ہے کہ مغربی عمارات کے نمونے پر بنائی جانے والی عمارت اکثر و بیشتر مقامی ضروریات کے مطابق نہیں ہوتیں۔ اس جگہ یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ برطانیہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کے برعکس پاکستان میں عمارات کی تعمیر کے لئے ماہرین فن تعمیر کی خدمات حاصل کرنے کی روایت نسبتاً نئی ہے۔ زیادہ تر عمارات مستری اور مالک مکان کی مشترکہ خواہشات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

ماہرین فن تعمیر کا دعویٰ ہے کہ نئی دنیا میں کوئی بھی طرز تعمیر باقی نہیں رہا اور نئی عمارات کی شکل و صورت وہ ہوتی ہے جو کم سے کم لاگت کے نتیجے میں خود بخود حاصل ہو جائے۔ اس کے علاوہ موسمی مقامی حالات کو مدنظر رکھ کر تحفظ کے جو انتظامات کیے جاتے ہیں وہ بھی اس شکل وصورت کو تشکیل دینے میں حصہ لیتے ہیں۔ چنانچہ تمام دنیا میں کم وبیش ایک جیسی عمارات تعمیر ہو رہی ہیں۔ البتہ موسمی اور مقامی حالات مختلف ہونے کی بنا پر ان میں تھوڑی بہت تبدیلی ہو سکتی ہے مثلاً پہاڑی علاقے میں پتھر سب سے ارزاں سامان تعمیر ہے۔ عمارات پتھر سے بنائی جا سکتی ہیں یا لاہور میں شدید دھوپ اور گرمی کے پیش نظر کھڑکیوں پر دھوپ سے بچنے کے لیے انتظامات کیے جائیں گے جو یورپ کی اکثر عمارات میں ضروری نہیں ہوتے۔ چنانچہ فن تعمیر اب فنون لطیفہ کی شاخ ہی نہیں رہی بلکہ اسے سائنسی طور پر عمدہ اور سستی عمارت تعمیر کرنے کا علم کہا جا سکتا ہے۔

ماہرین فن تعمیر یہ کہتے ہیں کہ عمارت کو ارزاں، کارآمد اور خوبصورت ہونا چاہیے۔ لیکن خوبصورتی کے لئے مزید رقم یا محنت کا استعمال غلط ہے بلکہ عمارات ازاں ترین، کارآمد ترین اور خوبصورت ترین ہو۔ ان اصولوں کو اگر زیر عمل لایا جائے تو بلاشبہ نہایت عمدہ عمارت بنائی جا سکتی ہے لیکن اکثر ماہرین اس پر عمل کرتے نظر نہیں آتے۔ بہر حال مستقبل میں یہ رجحان عام ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ دوسری جانب عوامی مطالبہ ہے جس کے تحت ہمارے معاشرے میں عمارت کو خاص مقام حاصل ہے۔ ماحول کی ضروریات کے مطابق ان میں کئی چیزیں غیر ضروری ہوتے ہوئے بھی اہم ہیں۔ ان سے ہماری جمالیاتی و جذباتی وابستگیاں ہیں۔ علاوہ ازیں جدید عمارات میں ایک روکھا پن ہے جو شاید مغربی عمارات سے متاثر ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ پہلے بنی ہوئی عمارات ہمیشہ ماہرین فن تعمیر کے ارتقائے فن میں بہت اہم حصہ لیتی ہیں چنانچہ جدید عمارت کسی نہ کسی طرح مغربی طرز تعمیر سے مشابہت رکھتی ہیں جو عوام کے لئے ناقابل فہم ہے۔ لاہور میں جہاں بہت سی بڑی بڑی عمارات مغربی فن تعمیر سے متاثر ہو کر بنائی گئی ہیں وہاں چھوٹے پیمانے پر رہائشی مکانات، کارخانے اور دیگر عمارات بھی تعمیر کی گئی ہیں جن کے لئے کسی ماہرین فن تعمیر کی خدمات حاصل نہیں کی گئیں۔ یہ بات خاص طور پر دلچسپ ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی تعمیرات میں مغربی نمونوں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں لاہور میں تعمیر ہونے والی سرکاری عمارات نے اس عوامی طرز تعمیر پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ حال میں (1970ء) الفلاح اور واپڈا ہاؤس جیسی

عمارات، جو غیر ملکی ماہرین نے ترتیب دی ہیں، بہت سی غیر سرکاری چھوٹی عمارات کے لئے نمونہ بنی ہوئی ہیں۔ بعض اوقات مقامی طرزِ تعمیر کی یہ نقالی نہایت خوبصورت اور دلچسپ ہوتی ہے۔ لاہور کے نئے رہائشی علاقوں مثلاً سمن آباد، شاد باغ، ماڈل ٹاؤن اور گلبرگ وغیرہ میں بھی اسی طرح کی نقالی کے دلچسپ نمونے مل جاتے ہیں۔ اس انداز میں بنائی ہوئی کئی عوامی عمارات ان عمارات سے بدر جہا بہتر ہیں جو ایسے ماہرین فن تعمیر نے بنائی ہیں جنہیں مغرب کی نقالی کے سوا کچھ نہیں آتا۔ عوامی عمارات میں اگرچہ یہ نقل موجود ہے لیکن ان میں ایک مقامی رنگ خلوص اور جذبہ جھلکتا نظر آتا ہے جو غیر ارادی طور پر ماحول سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔ ماہرین فن تعمیر نے اگر کہیں بلا وجہ مغربی طرز تعمیر کی نقل کی ہے تو وہ ہمیشہ غیر دلچسپ اور روکھی پھیکی رہی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ کہاں کہاں نقالی کی گئی ہے اور کس کس جگہ عوامی فن کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے میلوں ٹھیلوں میں تھیٹر، سرکس اور منڈلیاں لگتی ہیں۔ حالاں کہ تھیٹر کا تصور مغربی معلوم ہوتا ہے لیکن ان تماشوں کو عوامی سرپرستی اور دلچسپی حاصل ہوگئی ہے اور یہ ہمارے ماحول میں رچ بس گئے ہیں۔ چنانچہ نئے نئے اظہار اس ماحول سے نکلتے رہتے ہیں اور اس فن کو لوک فن کہا جاسکتا ہے۔

فن تعمیر میں اس نقالی کو کئی نام دیئے جا سکتے ہیں۔ عوامی اور لوک فن کہہ کر اس کی خوبصورتی اور دلکشی کی تعریف بھی کی جاسکتی ہے۔ غیر ملکی عمارات کی نقل کو موسمی لحاظ سے تکلیف دہ، مہنگا اور بے کار کہہ کر مذمت بھی کر سکتے ہیں۔ یہ عمارات ہمارے ماحول میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں اور ہمارے دور کی سب سے پائیدار تاریخ ہیں۔ اس دور کی سیاسی اقتصادی، ثقافتی، عمرانی، جمالیاتی اور تکنیکی صورت حال کی صحیح تصویر کے لئے یہ عوامی عمارات بہتر تاریخی حوالہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ لاہور میں بے شمار عوامی عمارات ایسی ہیں جو بہت خوبصورت اور آرام دہ ہیں۔ یہ اتفاقی طور پر بن گئی ہیں یا ان کے پیچھے سائنسی معلومات ہیں؟ یہ ایک الگ بحث ہے لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ عمارات کو خوبصورت ارزاں اور کارآمد بنانا ایک وقت طلب مسئلہ ہے اور اس کے لئے اندازے اور اتفاقات کا سہارا لینا مناسب نہیں۔ ماہرین فن تعمیر کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جائے گی اور عمدہ عمارات کے لئے اس فن کا استعمال ناگزیر ہے۔

عمارات کی تعمیر کا موجودہ نظام ہی غلط ہے۔ گلبرگ اور دیگر جدید آبادیوں میں ماہرین فن تعمیر

کی خدمات نہایت نامناسب طریقے سے استعمال کی گئی ہیں۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ نہ تو مالک مکان فن تعمیر سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور نہ ہی اکثر ماہرین اپنی معلومات اور تجربات کو صحیح طور سے استعمال کرتے ہیں۔ عمارات کو ترتیب و تنظیم دینے کے لئے جو فیس مقرر کی جاتی ہے وہ ایک طرف تو ماہرین کے لیے نہایت کم ہے اور دوسری جانب مالک مکان اس مد کو سراسر فضول اور اضافی اخراجات تصور کرتا ہے حالانکہ یہ چاہیے کہ ایک جانب ماہرین کے لئے اپنی فنی و اختراعی صلاحیتوں کے بھرپور مظاہرے کے مواقع ہوں اور دوسری جانب جدید فن تعمیر کے اصولوں کی بدولت اخراجات میں کمی ہو اور تکمیل شدہ عمارت اس عمارت سے نسبتاً سستی رہے جو کسی ماہر فن کی خدمات کے بغیر تعمیر کی گئی ہو۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ کسی ماہر کا مشورہ حاصل کرنا اکثر مہنگا پڑتا ہے چنانچہ لاہور میں نوے فی صد عمارات لوگوں کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہیں یا غیر تربیت یافتہ ڈرافس مین اور نام نہاد ''آرکی ٹیکٹ'' ''انجینئر'' وغیرہ کم پیسوں میں ایک نقشہ بنا دیتے ہیں جو کسی طرح بھی اس نقشے سے بہتر نہیں ہوتا جو مالک مکان خود بھی بنا سکتا ہے۔ یہ نظام سراسر گھاٹے کا سودا ہے جس سے مالک مکان ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے اور ایک ناپائیدار غیر کارآمد اور مہنگی عمارت تعمیر ہوتی ہے ایسی آبادیوں میں جہاں ماہرین فن تعمیر کی خدمات حاصل کرنا ضروری ہے۔ چور دروازے سے یہ غیر تربیت یافتہ یا نیم تربیت یافتہ لوگ گھس آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ گلبرگ، ماڈل ٹاؤن، شادمان کالونی وغیرہ میں بھی نہایت عجیب و غریب اور بے ڈھنگی عمارات کا سلسلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے کہیں بہتر یہ تھا کہ یہاں بھی عوامی فن تعمیر کو فروغ حاصل ہوتا۔ جو مہنگا غیر کارآمد اور فرسودہ ہونے کے باوجود ایک خاص دلکشی اور رنگینی رکھتا ہے۔

لاہور کے عوامی طرز تعمیر میں محرابیں، سنگ مرمر، رنگ برنگے پتھر، جالیاں، غسل خانے میں استعمال ہونے والے چمکدار ٹائیل، طرح طرح کے زیبائشی و آرائشی نقش و نگار اور شوخ و شنگ رنگ شامل ہیں۔ بعض جگہ یہ چیزیں اس افراط سے لگائی جاتی ہیں کہ عمارت پر ایک تصویر کا گمان ہوتا ہے۔ عوامی پسند و فکر کا اندازہ ان عمارت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس لوک فن میں جدت، طراحی اور نقل جاری ہے۔ چھوٹے رہائشی مکانات اور دکانوں سے لے کر کئی منزلہ عمارات اور کارخانوں تک میں یہ فن نشوونما پا رہا ہے۔ یہ اظہار جیسا کچھ بھی ہے، ہماری ثقافت کا ایک حصہ ہے اور اس میں بہت خوبصورت نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ فن تعمیر کے ماہرین کا فرض ہے کہ وہ اس عوامی فن کو بلاواسطہ طور پر جدید رجحانات اور

آسائشوں سے روشناس کرائیں۔ ابھی تک ان ماہرین کو بادل نخواستہ زحمت دی جاتی ہے حالانکہ یہ ملکی ترقی میں بہت کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایک طبقے کی نگاہ میں ان کی مہارت کا مصرف صرف یہ ہے کہ عمارات کو خوبصورت بنائیں، دوسری جانب وہ لوگ ہیں جو صرف لاگت میں کمی کو مدنظر رکھتے ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ عمارت کا کارآمد ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے اور ماہرین فن تعمیر سے یہ توقع رکھنی چاہیے کہ ان تینوں پہلوؤں پر نظر رکھیں گے۔

جدید فن تعمیر کا پورا پورا استعمال عوام کے رویے پر منحصر ہے۔ یہ رجحان اور انداز فکر کی بات ہے۔ جب تک ہمیں اپنی زندگی میں سائنسی معلومات کو استعمال کرنے کا خیال نہیں آئے گا۔ کوئی بھی علم یا فن پوری طرح کارآمد ثابت نہ ہوگا۔ اس طرح نہ صرف بڑے بڑے منصوبے بلکہ عوامی اور لوک فن بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

○

لاہور کی تاریخی وثقافتی اہمیت اور فروغ سیاحت

بیس لاکھ (1970ء) انسانوں کی یہ بستی جسے لاہور کہا جاتا ہے اپنی بے پناہ جاذبیت اور خوبصورتی کے باعث بہت سے سیاحوں اور مسافروں کے لیے مختصر یا طویل قیام کی جگہ بنی رہی ہے۔ لاہور کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت سے قطع نظر اس کا محل وقوع، موسم اور صنعتی وتجارتی سرگرمی بھی اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ زمانہ قدیم سے لاہور ایک پسندیدہ اور دل پذیر جائے قیام رہا ہے۔ مغل شہنشاہ نورالدین جہاں گیر کے ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خاص وعام کے لیے ایک محبوب شہر رہا ہے:

لاہور را بجان برابر خریدہ ایم
جاں دیدہ ایم و جنت دیگر خریدہ ایم

ہماری مشکل یہ ہے کہ محبت و دلفریبی سے پُر اس شہر سے ہماری دلچسپی لفظی رہ گئی ہے۔ آج لاہور میں ''قابل دید'' مقامات تلاش کرنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے اور قیام سے پہلے اور بہت سی ترجیحات کے علاوہ یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ لاہور کو ''لیا ہور'' یعنی'' اور لاؤ'' بھی کہا جاتا ہے۔ اسے لاہور اور اس کے باسیوں کی خوش قسمتی کہیے یا اس شہر خوباں کا طلسم کہ ان سب مشکلات کے باوجود لاہور کو چاہنے والوں اور لاہور کو دیکھنے والوں کی کمی نہیں ہوئی بلکہ اب تو ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ (1970ء)

لاہور کی تاریخ روایتی طور پر رام چند جی کے ایک بیٹے لَو سے شروع ہوتی ہے لیکن اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک طرف چند محققین اس شہر کی بنیاد ایسے عہد میں خیال کرتے ہیں جب وادی سندھ کی تہذیب ایام طفولیت میں تھی اور وہ اس شہر کو ''ار'' اور ''بابل'' کا ہم عصر قرار دیتے ہیں۔ (لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید۔ 1962ء) دوسری طرف حقیقت یہ بیان کی جاتی ہے کہ سلطان محمود

غزنوی سے پہلے اس شہر کا کوئی تحریری ثبوت موجود نہیں۔ مندھکور یا محمود پور کا قدیم سکوں اور دستاویز سے پتا چلتا ہے تو خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہی ہمارا لاہور ہوگا (ولی اللہ خان۔1960ء) بہر حال یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ لاہور نام کا کوئی شہر آج سے ایک ہزار سال پہلے بھی ضرور موجود تھا۔ اس کے بعد تاریخ میں بار بار لاہور یا اس کے مختلف اشکال میں ادا کیے ہوئے املا سے لہانور، لہور وغیرہ کا نام، اس کی تعریف اور اس کی اہمیت بہت کچھ بڑی تفصیل اور وضاحت سے دستیاب ہے۔

البیرونی کو لاہور کا پہلا مسلمان وقائع نویس اور سیاح قرار دینا چاہیے۔ اس نے ایک گائیڈ بک یا سفر نامہ بھی تحریر کیا اور ''کتاب الہند'' کی بدولت ایران اور وسط ایشیا میں لاہور کے فسانے عام ہوئے۔ جب لاہور پر سلطان محمود غزنوی کا قبضہ ہوا تو یہ شہر ان گنت سیاحوں، تاجروں اور مبلغوں کا میزبان رہا۔ حضرت علی ہجویری داتا گنج بخشؒ بھی لاہور آئے اور یہیں کے ہو رہے بلکہ یہ شہر آج بھی ''داتا کی نگری'' کہلاتا ہے۔ یہاں قطب الدین ایبک اور امیر تیمور جیسے تاریخ ساز حکمران قیام پذیر ہوئے۔ بابر نے اسی شہر پر اپنا قبضہ استوار کر کے ہندوستان پر حملہ آوری کی اور عظیم خانوادہ مغلیہ چغتائیہ کی بنیاد رکھی۔ بیرم خاں اسی کا شیدا رہا۔ نور جہاں اور جہانگیر لاہور سے محبت میں اس حد کو پہنچ گئے کہ بعد از وفات انہیں یہیں کی خاک میں دفن کیا گیا۔ یہ شہر مغل بادشاہ شاہ جہاں کی مقام ولادت اور شاہراہ کشمیر پر واقع منزلِ قیام کے علاوہ موسم بہار میں بادشاہ کے پسندیدہ باغ شالامار اور ثمن برج (شیش محل) کی تعمیر کے لیے منتخب کیا گیا۔ یہ دارالشکوہ کی دلچسپیوں کا مرکز رہا۔ اورنگ زیب کی شہرۂ آفاق اور شاہکار بادشاہی مسجد بھی مغلیہ سلطنت کے کسی اور شہر کی بجائے لاہور کی زینت بنی۔ لاہور کی کشش اور محبت مغلیہ سلطنت کے دورِ زوال میں بھی باقی رہی۔ اس دور کی یادگار بیگم پورہ، نواں کوٹ اور اچھرہ کی وسیع و عریض ذیلی آبادیاں ہیں جہاں تاریخی یادگاروں اور خوبصورت عمارتوں کا سراغ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ سکھوں کے دور میں جہاں ایک طرف تباہی و بربادی نظر آتی ہے وہاں رنجیت سنگھ کے خوشحال دور میں پنجاب، سرحد، کشمیر اور ملتان کے وسیع علاقے کا پایہ تخت ہونے کے سبب لاہور کو ایک بین الاقوامی اہمیت بھی حاصل ہوئی۔ یہاں یورپی ممالک سے سفیر، تاجر اور ملازمت کی تلاش میں آئے ہوئے فوجی افسر، طبیب، ماہرین فن آتے جاتے رہے۔ رنجیت سنگھ کے دور میں اندرونِ شہر نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں اور بہت سی پرانی حویلیاں مرمت و تبدیلی کے بعد قابل فخر رہائش گاہیں بن گئیں۔ قلعہ لاہور سے متصل مہاراجہ اور گروارجن دیو کی سمادھیاں بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔

لاہور مغربی فنِ تعمیر اور طرزِ رہائش سے رنجیت سنگھ کے دربار میں ملازم فرانسیسی اور دیگر یورپی افسروں کی ضروریات کی بنا پر متعارف ہوا۔ یہاں جنرل ونتورا، ایوی تابل، ایلارڈ اور ان کے ساتھیوں نے انارکلی کے گردونواح میں اپنی پسند کی رہائش گاہیں تعمیر کیں۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں نئی نئی عمارتیں اور جدید آبادیاں وجود میں آئیں۔ موجودہ شارع قائداعظم اس دور میں ''مال روڈ'' کہلاتی تھی اور اس کا انداز برطانوی نوآبادیاتی قصبات اور خود جزائر برطانیہ میں واقع شہروں کی مرکزی اور اہم شاہراہ کے نمونے پر پورا اترتا ہے۔ ڈونلڈ ٹاؤن، سول لائنز کا علاقہ تھا جہاں انگریزی حکمران اور ان سے منسلک یورپین آبادی رہتی تھی۔ میاں میر کی چھاؤنی اور شہر سے ملحق نئی آبادیاں، ریلوے اور محکمہ انہار کے عملے کو رہائشی سہولیات بہم پہنچانے کے لیے تشکیل دی گئیں، نوآبادیاتی طرزِ تعمیر کی غمازی کرتی ہیں یہ لاہور کے ماحول میں ایک نیا اور منفرد تجربہ تھا۔ برطانوی دور کا لاہور نہ صرف مقامی آبادی کے لیے ایک تاریخی اور ثقافتی تسلسل کا نشان تھا بلکہ یہاں اینگلوانڈین مشترک تہذیب کی چند جھلکیاں نظر آنے لگی تھیں۔ پنجاب ہائی کورٹ، لاہور میوزیم، پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس، چیفس کالج (ایچیسن کالج) اور بہت سی کمرشل عمارتیں اس انداز پر بنائی گئیں کہ یہ دونوں ثقافتی مخازن سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے ایک طرف جدید ضروریات پوری کرتی تھیں اور دوسری طرف ان کا ساز وسامان اور زیب وزیبائش مقامی وسائل اور فنی اظہار کے آئینہ دار تھے۔ یہ عمارتیں آج بھی لاہور کے لیے تاریخی یادگار ہیں اور ان کی وجہ سے لاہور کی سیاحتی اہمیت میں ایک اور جہت پیدا ہوتی ہے۔

برطانوی دور میں لاہور ایک مقبول ومعروف صوبائی صدر مقام رہا ہے۔ یہاں انگریز اور دوسرے یورپین باشندوں کی ایک بڑی تعداد رہائش پذیر تھی۔ ان کی ضروریات کے پیش نظر جم خانہ کلب، سول اینڈ ملٹری گزٹ، انگریزی طرز کی دکانیں اور سٹورز، ٹیلرز، فوٹوگرافرز، فرنیچر اور کیبنٹ میکرز، انگریزی سینما ہال، ریسٹورنٹ اور ہوٹل وغیرہ یہاں قائم ہوئے اور ایک عرصہ تک منافع بخش کاروبار کی صورت میں لاہور کی تجارتی واقتصادی سرگرمیوں کا حصہ بنے رہے۔

ادبی وفنی میدان میں بھی لاہور کے لیے انگریزی حکومت کے ایک سو سال بہت اہم ہیں۔ مقامی زبانوں میں شعروادب کے مشاہیر نے آنے والے دور کے لیے ایک بہت بڑا خزانہ تخلیق کیا جو ہماری روایت کا حصہ بن گیا۔ انگریزی ادب کی ایک شاخ جسے نوآبادیاتی دور سے منسلک کیا جاتا ہے، لاہور اور رڈیارڈ کیپلنگ کے حوالے سے محتاجِ تعارف نہیں۔ بہت سے غیر ملکی سیاح لاہور کو اسی حوالے

سے دیکھنے اور سمجھنے آتے ہیں۔ بہت سے انگریزی مصنفین نے لاہور کے پس منظر میں ناول اور مختصر کہانیاں تحریر کی ہیں جو قاری کے ذہن میں لاہور کا ایک رنگین اور افسانوی ماحول تخلیق کرتی ہیں۔ موجودہ دور میں پاکستانی، بھارتی اور انگریزی مصنفین نے آزادی سے قبل لاہور کی جو کیفیت اپنی تحریروں میں بیان کی ہے اسے لاہور کی بین الاقوامی شہرت میں ایک اضافہ سمجھنا چاہیے۔

برصغیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی میں لاہور ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ قرارداد پاکستان لاہور ہی میں منظور کی گئی جس کی یادگار ایک تاریخی اور سیاحتی مقام کی حیثیت سے مینار پاکستان کی صورت میں موجود ہے۔ مسلم لیگ اور آل انڈیا کانگریس کے اجلاس لاہور میں منعقد ہوتے رہے۔ موچی گیٹ، میوپارک، برکت علی اسلامیہ ہال، بریڈلا ہال، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ اور ہندوؤں کی سرپرستی میں قائم شدہ موجودہ ایم اے او کالج اور سناتن دھرم کالج (اسلامیہ کالج) سول لائنز اس سیاسی سرگرمی کے مراکز تھے۔ یہاں برصغیر کی سیاسی اور ثقافتی لحاظ سے قدآور شخصیات نے تاریخی خطبات دیئے اور ان کی گونج آج بھی ایسی دستاویزات میں نظر آتی ہے جو تحریک آزادی کے لیے اہم وسیلہ تحقیق ہیں۔

لاہور کے گلی کوچوں کی مہک نے اقبال کے زمزمہ بار نغموں میں جگہ پائی، یہاں ایک نہیں ہزاروں شاعر اور ادیب قیام پذیر رہے اور ان کی نغمہ سرائی سے لاہور کو ایک لازوال ثقافتی مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ لاہور سے محبت اور اسے اپنی تحریر وتقریر کے ذریعے دنیا میں روشناس کرانے کی اس قدیم روایت میں بے شمار نام تحریر کیے جاسکتے ہیں لیکن سیاحتی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ لاہور کا دل نشین اور افسانوی تاثر قائم کرنے میں مولانا محمد حسین آزاد، اختر شیرانی، شوکت تھانوی، احسان دانش، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، انتظار حسین، منیر نیازی اور منو بھائی نے لاہور کو اپنی جگمگاتی تحریروں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ اردو زبان کا کوئی بھی قاری لاہور آنے کی ایک بار آرزو یا جستجو ضرور کرتا ہے۔

لاہور میں سیاحوں کی آمدورفت کا کچھ اندازہ تو اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں عارضی رہائش یعنی ہوٹل، ہوسٹل یا سرائے وغیرہ کا انتظام کس طرح اور کتنا ہے۔ اس کے علاوہ لاہور کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔'' اس سادہ سے جملے سے پنجاب کے ایسے لوگوں کے جذبات اور ارادوں کا سراغ ملتا ہے جو لاہور کے اردگرد واقع شہروں اور دیہات میں رہتے ہیں۔ تعلیم، تفریح، کاروبار ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں بہت سے لوگ لاہور آتے جاتے رہتے

ہیں۔ چنانچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ لاہور میں آنے والے سیاحوں کی اصل تعداد کتنی ہے۔ ہمارے اندازے کے مطابق، جو گزشتہ ایک سال کی تحقیق پر مبنی ہے (72-1971ء) پاکستان کی فروغ سیاحت کارپوریشن کے اعداد و شمار تین لاکھ سیاح فی سال کا تخمینہ پیش کرتے ہیں۔ غیر ملکی سیاحوں کی تعداد میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا ہے (1972ء)۔ اس کی وجوہات مختلف النوع ہیں ایک تو یہ کہ جغرافیائی لحاظ سے لاہور کو ایک بین الاقوامی حیثیت مل چکی ہے اور دنیا کے کم و بیش ہر علاقے میں لاہور کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات ضرور موجود ہیں۔ بنیادی اہمیت کی ایک وجہ وہ عالمی تحریک ہے جس کے تحت مغربی دنیا سے نوجوان طبقہ ''پرانے مشرق'' کو ڈھونڈنے ترکی، ایران اور افغانستان کے راستے لاہور آ رہا ہے اور یہاں سے بھارت، نیپال، تھائی لینڈ، سری لنکا اور بالی (انڈونیشیا) تک جا رہا ہے۔ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے سیاحوں (ہپیوں) کی ہے جو کاٹھ منڈو میں آزادی سے حشیش اور دوسری نشہ آور چیزیں استعمال کرنے کی آرزو میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

لاہور سے گزرنے والا ہر وہ سیاح جو خوش خوش واپس گھر پہنچتا ہے، دراصل لاہور کا ثقافتی سفیر ہوتا ہے۔ اس کی آواز سے ہمارے لاہور کی خوشبو پھیلتی جاتی ہے اور لاہور آنے والے سیاحوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ ہماری اور ہمارے شہر کی خوش نصیبی ہے کہ آج کل اسے ایک بین الاقوامی شاہراہ پر بے حد اہمیت حاصل ہے (1970ء) اور اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ سیاحت کے فروغ سے نہ صرف ہم اپنی قومی آمدنی جو کہ زرِ مبادلہ کی صورت میں ہوگی، بڑھا سکتے ہیں بلکہ پاکستان کے لیے دنیا کے کونے کونے میں مخلص سفیر بھی بنا سکتے ہیں۔ لاہور شہر کی بہت سی مالی اور تکنیکی مشکلات اس سیاحتی فروغ سے دور ہو سکتی ہیں اور کئی ادھورے منصوبے جو اقتصادی طور پر فائدہ مند ہونے کے باوجود مالی ضروریات کے پورا نہ ہونے سے تعطل کا شکار ہیں، مکمل کیے جا سکتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سیاحت کے فروغ کے لیے شہر کے بنیادی ڈھانچے (Infrastructure) پر جو بھی رقم صرف کی جاتی ہے، وہ نہ صرف سیاحت کی مد میں آمدنی کی صورت میں وصول ہوتی رہتی ہے بلکہ شہر کی ثقافتی، صنعتی، تجارتی ترقی اور مالی منفعت کی صورت میں فائدے کا باعث ہوتی ہے۔ سیاحتی منصوبہ بندی اور فروغ سے لاہور کے شہریوں کے لیے ترقی و بہبود کی کئی راہیں کھل سکتی ہیں۔ مثلاً لاہور کے شہری بھی ان تمام سہولیات تفریحی مراکز، تاریخی مقامات، ثقافتی میلوں، معلوماتی اداروں اور ذرائع آمد و رفت سے مستفید ہوں گے جنہیں سیاحتی ترقی کے لیے لازمی قرار دے کر سرمایہ کاری کے لیے منتخب کر لیا جائے۔ اس طرح فروغ

سیاحت اور لاہور کی تفریحی، ثقافتی اور جمالیاتی پہلوؤں سے ترقی کے منصوبے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔ اس امر کو لاہور کے شہری اور ان کے نمائندے بخوبی سمجھتے ہیں چنانچہ موجودہ زمانے کی اصطلاح مقامی اشتراک عمل (Community Participation) کا تصور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔

انارکلی اور جہانگیر کا یہ شہر جس میں کبھی پانچ سو سے زیادہ باغات تھے، رنگین پچی کاری سے سجی ہوئی حسین عمارتیں، مسجدیں، سنگ مرمر اور سنگ سرخ کے پرشکوہ مزارات، چمکتے ہوئے گنبد اور فلک بوس مینار اس کے نشان تھے۔ جہاں زر و جواہر سے جگمگاتی دکانیں قلعہ شاہی سے چوک دارا شکوہ اور محلہ حاجی سوائے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جہاں حکیم حمام کا نادر روزگار طلسماتی تالاب و حوض واقع تھا۔ باغ دلکشا و دل آمیز و دل افروز بہاروں کے امین تھے، وہ ابھی تک لاہور کے خوابیدہ اور رومانوی تصور کے لیے افسانہ ہوتے ہوئے بھی ایک حقیقت ہیں۔ لاہور کی خصوصیات کچھ بدل گئیں، کچھ ختم ہو گئیں لیکن ماضی کبھی ختم نہیں ہوتا اور حال کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اسے لاہور کی روایت سمجھیں یا خصوصیت کہ یہاں کی تاریخ ہی یہاں کی زندگی ہے۔ اور یہی زندگی اور اس کی چہل پہل وہ بنیاد بن سکتی ہے جو سیاحوں کے لیے لاہور کو مزید پرکشش بنانے کی منصوبہ بندی کے لیے ضروری ہے۔ بے جان عمارتوں، اجاڑ باغوں، وحشت ناک کھنڈرات، فرسودہ کہانیوں اور لاہور کی پیچیدہ ثقافتی و سماجی حقیقتوں کی بے معنی تشہیر سے اب مزید کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

دنیا میں ایک مسلسل مقابلے اور مقامی و قومی تحفظات کی کیفیت سامنے آ رہی ہے۔ لاہور کے لیے مستقبل میں کئی طرح کے چیلنج ہیں۔ سیاحت کے فروغ میں کئی رکاوٹیں بھی پیش آ سکتی ہیں۔ ایسی صورت میں منصوبہ بندی کی ضرورت کو وقت کی آواز سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے۔

لاہور اور سیاحت میں گہرا تعلق سامنے رکھتے ہوئے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس ضمن میں فروغ سیاحت کے لیے کوئی شعوری کوشش کی گئی ہے یا نہیں۔ فروغ سیاحت اگر شہر اور ملک کے لیے فائدہ مند اور ضروری ہے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس سمت میں آگے بڑھا جائے۔ قیام پاکستان کے بعد جو مسئلہ بار بار توجہ کا مرکز رہا، وہ یہ تھا کہ پاکستان کے پاس کیا موجود ہے؟ اس وقت لاہور پاکستان میں واحد شہر تھا جہاں انتظامی اور ثقافتی سہولیات موجود تھیں۔ یہاں تعلیمی اور کاروباری مراکز تھے۔ ریلوے کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ صوبہ پنجاب کا صدر مقام ہونے کے لحاظ سے یہاں انتظامی مشنری کے لیے سہولیات بھی نسبتاً زیادہ

تھیں۔ تعلیمی، صحافتی اور ثقافتی سرگرمیوں کی وجہ سے لاہور غیر منقسم ہندوستان کے پیش رو شہروں میں شامل تھا۔ اس وقت یہ خیال کیا گیا کہ سیاحت کے فروغ کے لیے کسی خاص منصوبے کی ضرورت نہیں۔ بعد میں جب ''ڈائرکٹوریٹ آف ٹورازم'' قائم کیا گیا تو پاکستان کے مختلف شہروں اور تاریخی مقامات کے متعلق معلومات اکٹھی کی گئیں۔ پاکستان ویسٹرن ریلوے (1970ء) جو ان دنوں نارتھ ویسٹرن ریلوے کہلاتی تھی، سیاحت کو اپنا میدان سمجھتی تھی چنانچہ ریلوے کی آمدنی میں اضافے اور سیاحوں کی سہولت کے خیال سے پہلی بار لاہور اور چند ایسے تاریخی و تفریحی مقامات کے متعلق مختصر کتابچے شائع کیے گئے جہاں ریلوے سٹیشن واقع تھے یا وہاں تک رسائی حاصل تھی۔ یہ سیاحتی معلوماتی کتابچے ابھی تک پاکستان کے سیاحتی لٹریچر میں مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ 1966ء میں سیاحت کے فروغ کے لیے ایک فرانسیسی فرم کے ذریعہ ایک ''ماسٹر پلان'' یا ''ہمہ گیر منصوبہ'' تیار کرایا گیا۔ اس منصوبے میں جو کچھ ہے اب تک (1972ء) فروغِ سیاحت سے وابستہ حکام کے لیے حدیث کا درجہ رکھتا ہے اور اس کے بعد کسی تحقیق یا اضافے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

اسی ''ماسٹر پلان'' کے تحت محکمہ سیاحت کی جگہ پاکستان کی فروغ سیاحت کارپوریشن یعنی پی ٹی ڈی سی اور ایک ذیلی ادارہ پاکستان ٹورز لمیٹڈ قائم کیے گئے۔ آخر الذکر تو حکومت کو شاندار مالی نقصان پہنچا کر وفات پا گئے البتہ پی ٹی ڈی سی کا مستقبل ابھی تک ''ہے اور نہیں ہے'' کے درمیان لٹک رہا ہے (1972ء اور 2002ء میں یہی صورت حال نظر آتی ہے)۔ اس کے حق میں کیا دلائل ہیں یہ تو معلوم نہیں کیا جا سکتا البتہ پاکستان میں فروغ سیاحت یا بقائے سیاحت کے لیے کارپوریشن کے مختلف فرائض اور حقوق پر بحث جاری ہے۔ (1972ء)

موجودہ حکومت (1972ء) کے تحت سیاحت کی نئی وزارت تشکیل دی گئی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اعلیٰ ترین سطح پر سیاحت کے لیے ایک ذمہ دار ادارے کی موجودگی سیاحت کے فروغ اور اس طرح پاکستان کی ثقافتی و اقتصادی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

لاہور جیسے خوبصورت اور پرکشش شہر کی بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ اسے سمجھانے والے خود اسے نہیں جانتے اور نہ ہی یہ سمجھ سکے ہیں کہ لاہور آنے والا کیا توقعات لے کر آتا ہے۔ زندہ دلان لاہور اپنے شہر کو ایک مثالی سیاحتی مرکز کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں لیکن پہلی کمزوری جو واضح طور پر سامنے آتی ہے

وہ معلومات کے حصول میں دشواریاں ہیں۔ سیاح کی توجہ ایسی جگہوں، موقعوں اور شخصیات کی جانب ہوتی ہے جن کا ذکر اور تفصیل شاید ہی اس سطحی معلومات سے مل سکتا ہے جو سیاحوں کو فراہم کیے گئے رنگا رنگ کتابچوں میں موجود ہے۔ بہت سی تاریخی عمارتیں معدوم ہو چکیں، کئی ثقافتی وتہذیبی میلے بند ہو گئے، لاہور کی کئی خصوصیات متروک ہو چکیں لیکن ابھی تک سیاح ان کے متعلق استفسار کرتے ہیں کیوں کہ انہیں یہی معلوم ہے کہ وہ لاہور میں سالانہ ہارس اینڈ کیٹل شو دیکھ سکتے ہیں اور سپیرے کی بین پر سانپ کا رقص یا تانگے پر شارع قائداعظم کی سیر کا مزہ لے سکتے ہیں۔ (1972ء)

ابھی تک یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ لاہور میں سیاحت کے دفتر معلومات سے رابطہ کرنے والے سیاحوں کی نوعیت کیا ہے؟ غالباً ان میں بڑی تعداد ایسے سیاحوں کی ہوگی جو بروشر (کتابچے) میں نمایاں طور پر نظر آنے والے مہنگے ہوٹلوں کے پتے اور فون نمبر وغیرہ جان کر کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی طرح بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ، شالیمار باغ، جہانگیر کے مقبرے اور وزیر خاں کی مسجد کے علاوہ کسی بھی دور کی کسی بھی تاریخی عمارت کے بارے میں کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ (1972ء)

لاہور کی بسنت، شاہی خانقاہی دنگل، کرکٹ میچ، انارکلی کی چاند رات، اندرون شہر کا جشن عید میلاد النبیؐ اور کارنیوال، دریائے راوی میں کشتی رانی کا انٹر کالجیٹ ٹورنامنٹ، صوبائی وقومی سطح کے اردو و پنجابی مشاعرے، چوک نواب صاحب کی محرم، پنجاب کانسٹبلری اور محکمہ جیل خانہ جات کے شہرہ آفاق بینڈ، باری سٹوڈیوز کا مصنوعی گاؤں، انارکلی کا مقبرہ اور ریکارڈ آفس، فقیر خانہ کے نوادرات، علامہ اقبال کی رہائش گاہیں، مسجد مریم زمانی، شاہدرہ نیشنل پارک، زیب النساء کا مقبرہ، حویلی نونہال سنگھ، چونا منڈی تھانے کے زیر قبضہ حویلی دھیان سنگھ اور ملحقہ عمارات اور اسی طرح کی بہت سی خصوصیات سیاحوں کے لیے لاہور آنے کی ایک معقول وجہ بن سکتی ہیں۔

لاہور میں فروغ سیاحت کے لیے جو اقدام اٹھائے جا سکتے ہیں، ان کے لیے ایک محتاط منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ راقم الحروف نے فن تعمیر کے حوالے سے لاہور کی سیاحتی اہمیت اور منصوبہ بندی پر ایک سال کے عرصے میں جو تحقیقی کام کیا ہے، اس میں سفارشات مرتب کرتے وقت پہلے سے موجود قلیل یا طویل المیعاد منصوبہ بندی کے فقدان کا شدت سے احساس ہوا۔ سائنسی بنیاد پر کیا جانے والا ایک ایسا سروے جس میں فروغ سیاحت کے لیے ضروری اقدامات کا اندازہ لگانے کے لیے اہم

اعداد و شمار اکٹھے کیے جائیں، اس سلسلے میں پہلا قدم ہوگا۔ لاہور کے بارے میں اردو اور بین الاقوامی زبانوں میں عمدہ اور صحیح معلومات شائع ہونی چاہئیں۔ تاریخی مقامات اور ثقافتی تقریبات کی تشہیر بھی موثر انداز سے ہونی چاہیے۔ ایک سالانہ تقریب نامہ اور سیاحت سے متعلق ہفتہ وار یا ماہانہ مجلّہ عالمی سطح پر سیاحت کی صنعت میں لاہور کے لیے جگہ بنا سکے گا۔ اضلاعی مراکز میں ''لاہور ہاؤس'' کے نام سے معلومات اور سیاحتی دفاتر قائم کیے جاسکتے ہیں جہاں لاہور کے لیے نقل و حمل اور رہائش کی معلومات اور بکنگ بھی ہو سکے۔ اس طرح گھریلو یا مقامی سیاحت کو فروغ حاصل ہوگا۔ آپ اس مجبوری اور مایوسی کے عالم کو سمجھ سکتے ہیں جب کسی دور افتادہ شہر سے آنے والی کالج یا سکول کے طالب علموں کی بس لاہور میوزیم کے دروازے سے آگے نہیں جاسکتی کیوں کہ بدقسمتی سے اس دن ٹور اور میوزیم کی چھٹی ایک ہی ساتھ واقع ہوگئی ہوں۔ معلومات کا حصول ایسے مقامی سیاحوں کے لیے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ بین الاقوامی یا فرسٹ کلاس سیاحوں کے لیے۔

قلعہ لاہور اور اس سے ملحقہ علاقے سیاحوں کے لیے خصوصی کشش رکھتے ہیں۔ اس تاریخی علاقے کو مرکزی اہمیت دے کر منصوبہ فروغ سیاحت لاہور کے لیے ایک ماڈل یا مثالی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ بعدازاں یکے بعد دیگرے لاہور کے مزید علاقوں کو بھی سیاحی دلکشی اور شہری ترویج کی ترجیحات کے لحاظ سے ترقی دی جاسکتی ہے، عالمی تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ماہرین فن تعمیر اور فنون بصری نے ہی سیاحت کے کامیاب منصوبے تیار کیے ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہونے سے بہت سی قوموں نے ثقافتی اور اقتصادی لحاظ سے شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اس سلسلے میں فروغ سیاحت کے وہ منصوبے مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں جو جاپان، سری لنکا، میکسیکو اور سوئٹزرلینڈ میں 1960ء کی دہائی میں بنائے گئے ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ پاکستان میں ماہر فن تعمیر کو عموماً ایک ایسا فن کار سمجھا جاتا ہے جسے ''عمارت میں خوبصورتی پیدا کرنے'' کے لیے رجوع کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ ان کا کام تخلیق اور منصوبہ بندی کے اہم امور سے منسلک ہے جو زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر متاثر ہوتا ہے جو حواس خمسہ سے فنون لطیفہ اور فنون بصری تک کے ضمن میں آتے ہیں۔ عمارت کی زیب و زیبائش آج سے ایک صدی پہلے کا افسانہ ہے۔ اس وقت فروغ سیاحت کے لیے معلومات اور فنی استعداد تلاش کرنے والوں کے ذہن میں جو بہت بڑا سوالیہ نشان ہے کہ ''کون کیا اور کیسے کرے گا؟'' اس سوال کا ایک جواب پہلے تحریر کیا جاچکا ہے یعنی

دوسرے ممالک کے تجربے سے فائدہ ضرور اٹھانا چاہیے لیکن مقامی حالات کو صحیح طریقے سے سمجھتے ہوئے منصوبہ بندی صرف ماہرین فن تعمیر اور ماہرین فنون بصری کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ سیاحت کو آج ایک صنعت کا درجہ دیا جا رہا ہے اور دنیا کے بہت سے ممالک میں اسے قومی آمدنی کا اہم ترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ نہ معلوم پاکستان میں وہ منزل کتنی دور ہے جب کوئی لاہور کو اس شکل میں روشناس کرائے گا کہ یہ ہمایوں کے عہد میں دنیا کا ایک بہت ترقی یافتہ فلکیاتی تحقیقی مرکز تھا جسے اس وقت کے عظیم سائنس دانوں کی خدمات حاصل تھیں اور نیلا گنبد کے پاس وہ ''اسطرلاب'' تیار کیے جاتے تھے جو آج دنیا کے بڑے بڑے عجائب گھروں میں ''صنع فی لاہور'' یعنی لاہور میں بنایا گیا کی کندہ شدہ تحریر کے ساتھ موجود ہیں۔ آج کل کا کمپیوٹر جو فلکیاتی حساب کتاب لگانے میں مدد ہوتا ہے اور جس کی عدم موجودگی میں خلائی سفر اور چاند پر پہنچنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا (1969ء) اسی اسطرلاب کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔

O

متفرقات

عین کی داستان

نیشنل کالج میں ایک برگد کا درخت ہے (1970ء) بہت گھنا اور بوڑھا۔ سنا جاتا ہے کہ اس کالج کے سبھی اہم فیصلے اور معرکے اسی درخت کے سائے تلے ہوئے۔ انہی میں ایک فیصلہ ''عین'' کی اشاعت سے متعلق تھا۔ یہاں کے فنکاروں کو شدت سے احساس ہوا کہ ان کی آواز زیادہ دور تک نہیں پہنچ پاتی ''عین''، یعنی آنکھ وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے فنکاروں کا پیغام منتقل ہوتا ہے اور یہی ہمارے سہ ماہی جریدے کا عنوان قرار پایا۔

''عین'' ایک کالج کا رسمی رسالہ ہی نہیں بلکہ کوشش یہ کی جارہی ہے کہ اسے بصری فنون کا ایک مستند جریدہ بنایا جائے چنانچہ اس کے مندرجات میں آپ کو وہ افسانے، نظمیں یا ہلکے پھلکے مضامین شاید نہ مل سکیں جو عام کالج میگزین کے لازمی جزو خیال کیے جاتے ہیں۔

''عین'' کا پہلا شمارہ صرف ایک خاکہ ہے اس میں رنگ بھرنا اور اسے ایک معیاری جریدہ بنانا فی الحال اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی بنا پر ممکن نہیں تھا۔ امید کی گنجائش موجود ہے کہ آئندہ آنے والے شمارے تصور اور حقیقت میں فاصلہ کم کردیں گے۔

''عین'' کے صفحات پاکستان کے ان تمام لکھنے والوں کے منتظر ہیں جو فن اور فن کاروں سے محبت کرتے ہیں۔ انسان سے محبت کرتے ہیں۔ مدیر رضوان عظیم

○

ملتان دارالامان

گردوگرما گداوگورستان کا شہر کتنا پرانا ہے، یہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ یہاں اونچے اونچے گنبدوں والے پرعظمت مزار، ویران کھنڈر، آباد گلیاں اور کارخانوں کا شور سب کچھ موجود ہے۔ شام کے دھندلکے میں جب شہر کے نقوش آسمان کی وسعتوں سے ملتے ہیں تو کہیں وہ حسین مینار نظر آتے ہیں جہاں صدیوں سے پرندوں نے آشیانے بنا رکھے ہیں۔ کہیں وہ پرشکوہ گنبد ہیں جن کے نیچے اللہ کے غازی اور پراسرار بندے مدفون ہیں۔ کہیں وہ بلند عمارتیں جھلکیاں دیتی ہیں جو موجودہ دور میں ملتان کی عظمت، دولت اور وقار کی ضامن ہیں۔ ملتان خوبصورتی کا شہر ہے۔ گرم اور پراسرار خاموش سی خوبصورتی! اسی خوبصورتی کو دیکھتے ہوئے سیاح بہت سی کمزوریاں نظرانداز بھی کر دیتا ہے۔ یہاں کی گردآلود فضا، بے ہنگم ٹریفک، چبھتی ہوئی گرمی اور شوروغل یقیناً گراں گزرتے ہیں لیکن ملتان کے رہنے والے شاید ان کمزوریوں سے واقف ہیں اور ان کا توڑ بھی جانتے ہیں۔ یہاں دل نشین مقامات اور مہمان نوازی کی اتنی فراوانی ہے کہ سیاح مبہوت رہ جاتا ہے اور اسے ملتان کے کمزور پہلوؤں کو جاننے کا موقع ہی کم ملتا ہے۔ ملتان کی اعلیٰ دستکاریاں اور عوامی فنون زندہ جاوید ہیں۔ یہاں کی خوبصورت نیلی سفید روغنی ٹائلیں، حسین رنگوں سے سجائے ہوئے اونٹ کی کھال سے تیار شدہ لیمپ شیڈ، طرح طرح کا سوتی کپڑا اور دیگر مصنوعات اور رسیلے آم، صدیوں پرانی تاریخی عمارتیں اور عظیم المرتبت اولیاء وصوفیاء کے مزارات یہ سب ملتان کا طرۂ امتیاز ہیں۔ وہ شاعر جس نے کبھی کہا تھا: ''چہار چیز است تحفہ ملتان'' آج اسی شش وپنج میں مبتلا ہو تاکہ تحفوں کی تعداد کیا مقرر کی جائے۔ ملتان کے پاس بہت کچھ ہے۔

مشہور مسلمان عالم ابوریحان البیرونی کے اندازے سے ملتان کے ابتدائی آثار کوئی دو لاکھ سترہ ہزار سال پہلے بھی ملتے تھے۔ یہ اندازہ ہندوؤں کی مذہبی روایتوں کی بنیاد پر لگایا گیا تھا۔ ملتان کی گرمی شروع ہی سے انسان کو متاثر کیے ہوئے ہے۔ اس گرمی کا براہ راست تعلق سورج سے ہے۔ جس کی تیز اور

عمودی شعائیں ملتان کو جھلسائے دیتی ہیں۔ چنانچہ ملتان میں ایسی بہت سی کہانیاں اور عوامی گیت مل جائیں گے جو سورج اور گرمی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملتان ابتدا ہی سے سورج دیوتا کی پرستش کا مرکز بنا رہا۔ اسی سلسلے میں ہندوؤں کی مذہبی روایات نے جنم لیا۔ البیرونی کے بیان کے مطابق اس کا پہلا نام کسیاپ پورا تھا۔ کس یاپ یہاں کا راجہ تھا جو ہندوؤں کے عقیدے میں سب سے بڑے دیوتا برہما کا پوتا تھا۔ برہما ہندو دیومالا کا وہ دیوتا ہے جس کے بارہ بیٹے تھے۔ یہ سورج دیوتا کہلاتے تھے۔ اس تعلق کو ملتان سے وابستہ کر لینا قابل فہم ہے۔ کسیاپ کا ایک بیٹا اس کا جانشین بنا۔ اسے راجہ ہرن کس یاپ یا راجہ ہرن کش لکھا گیا ہے۔ یہ راجہ بڑا بدمزاج اور بے راہرو تھا جس طرح سے اس کا کردار بیان کیا گیا وہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ شداد اور نمرود کی شخصیت کا ملاپ اس ایک فرد میں ہو گیا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ دو کردار ہندو دیومالا میں شامل کر دیئے گئے ہوں اور عرصہ دراز کے باعث اس حالت کو پہنچے ہوں کہ ہندو اسے اپنی تاریخ کا ایک کردار سمجھنے لگے۔

بہر حال حقیقت کچھ بھی ہو کہانی اس طرح ہے کہ راجہ ہرن کسیاپ کا ایک بیٹا تھا جس کا نام پرہلاد تھا۔ یہ بہت نیک اور حق پرست شہزادہ تھا اور اپنے باپ کی بدکرداری اور دہریت سے نالاں تھا۔ اسے راجہ ہرن کسیاپ نے بلا بھیجا اور چند سوالات کیے۔ پرہلاد نے جو جواب دیئے وہ کچھ ایسے باغیانہ جذبات رکھتے تھے کہ راجہ ہرن کسیاپ سیخ پا ہو گیا اور حکم دیا کہ راجکمار کو سزا دی جائے۔ پرہلاد باز نہ آیا کئی مرتبہ سخت سزا دینے کی کوشش کی گئی لیکن راجکمار ہر بار بچ نکلتا۔ بالآخر راجہ ہرن کسیاپ نے بھگت پرہلاد کو جلتی آگ میں پھینکنے کا حکم دیا لیکن یہ آگ پرہلاد کے لئے سرد ہو گئی اور وہ صحیح سلامت باہر نکل آیا۔ جب راجہ ہرن کسیاپ کی فرعونیت میں اضافہ ہوا تو اسے دیوتاؤں کی جانب سے سزا دی گئی اور اس کی مقرر کردہ شرط کے مطابق ایسی حالت میں ہلاک کیا گیا جب نہ دن تھا نہ رات اور نہ وہ آسمان پر تھا نہ زمین پر بلکہ وشنو دیوتا نے جو ایک شیر کی شکل میں پتھر کے ستون سے نمودار ہوا تھا، اسے اپنے پنجے میں اٹھا رکھا تھا اور وہ شام کے جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ اس واقع کی یاد میں ملتان کو ایک تیرتھ کا درجہ دیا گیا۔ یہاں وشنو یا سورج دیوتا کی پوجا کے لئے ایک بہت بڑا مندر بنایا گیا اور شہر کا نام پرہلاد پور رکھا گیا۔ یہ شہر اسی طرح صدیوں تک نیم تاریکی میں گم رہا۔ یہاں کے افسانوی اور پراسرار ماحول سے کئی کہانیاں جنم لیتی رہیں۔ سورج دیوتا ہر سال قہر بن کر آتا، ملتان میں گرمی بڑھتی، سورج دیوتا کی پوجا ہوتی، دور دراز سے چڑھاوے آتے اور تیرتھ کرنے والوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ ملتان اسی روش پر چلتا رہا حتیٰ کہ اللہ نے اس خطہ ارض کی قسمت

پھیری۔ جہالت اور غیر یقینی حالت ختم کرنے اس کے مجاہد اور پیغام بر ملتان تک آ پہنچے اور یہاں اسلام کا نور پھیلا۔

فردوسی نے شاہنامہ میں ایک جگہ بیان کیا ہے کہ شاہ فارس دارا کے دربار میں ہندوستان سے سترہ شہزادے حاضر رہتے تھے ان میں سے ایک ملتان کا شہزادہ تھا۔ چنانچہ یہ بات قابل غور ہے کہ اس وقت بھی ملتان کی خاص اہمیت تھی اور یہاں کے حاکم، دارا سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔320 قبل از مسیح جب سکندر اعظم نے حملہ کیا تو ایک قبیلہ ملوئی یا ملی نے جھنگ سے آگے چناب کے پار سخت مقابلہ کیا۔ سکندر کے بازوؤں میں ایک زہر آلود تیر بھی لگا جو بعد ازاں بابل کے مقام پر اس کی موت کا سبب بنا۔ اسی قوم کا شہر ''ملی ستھان'' تھا یعنی ''ملی کی جگہ'' یہی نام آج ملتان بن چکا ہے۔ باختری یونانی حکمران ملتان پر دیر تک حکومت کرتے رہے۔ یہاں کی ثقافت میں ان کے قصے ابھی تک ملتے ہیں۔ چینی سیاح ہیون سانگ نے 641ء میں سورج مندر کا دیدار کیا۔ وہ شہر کا نام مولو سنا پولو یا ملستھان پور الکھتا ہے۔ محمد بن قاسم نے 713ء میں سندھ کے راستے ملتان پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ یہاں ایک مستقل اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔ قلعہ کہنہ میں قدیم جامع مسجد کے آثار ملے ہیں جس کے متعلق خیال ہے کہ یہ محمد بن قاسم نے تعمیر کرائی تھی۔ اس تاریخ ساز واقعے سے اب تک مسلمان ہی ملتان کے حاکم رہے ہیں۔ صرف 1818ء سے 1947ء تک کا زمانہ ایسا تھا جب سکھ اور انگریز یکے بعد دیگرے تخت حکومت پر قابض رہے لیکن یہاں آبادی کی اکثریت ہمیشہ مسلمانوں ہی کی رہی۔ کوئی بارہ صدیاں گزریں کہ ملتان کی فضا میں اذان کی صدائیں گونجتی رہی ہیں اور اس طرح یہ برصغیر پاک و ہند کا قدیم ترین اور مسلسل آباد اسلامی شہر ہے۔

713ء سے 781ء تک ملتان اموی اور عباسی خلافت کے بھیجے ہوئے امیروں کے زیر حکومت رہا۔ 781ء میں ایرانی، صفاری اور سمرقند و بخارا کے سامانی امیر یہاں حکمران رہے۔ 980ء سے 1010ء تک قرامطہ حکومت کرتے رہے۔ یہ دور سیاسی اور سماجی افتراق و انتشار کا دور تھا۔ 1010ء میں سلطان محمود غزنوی نے ملتان پر قبضہ کر لیا۔ 1173ء تک یہاں سلاطین غزنویہ حکومت کرتے رہے۔ اس کے بعد سلطان شہاب الدین محمد غوری کا قبضہ رہا، اسی کے مقرر کردہ گورنر قباچہ نے محمد غوری کی وفات کے فوراً بعد خودمختاری کا اعلان کر دیا اور 1227ء تک ملتان کا بلا شرکت غیرے حکمران رہا۔ بالآخر سلطان دہلی شمس الدین التمش کی افواج نے اسے شکست دی۔ ملتان سے فرار ہوتے ہوئے وہ دریائے سندھ کی لہروں میں

غرق ہوگیا۔ اسی دوران مغل اقوام نے ملتان پر حملے شروع کیے اور غیاث الدین بلبن نے عہد میں یہاں ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں سلطان بلبن کا محبوب فرزند اور ولی عہد شہزادہ محمد ہلاک ہوگیا۔ اس کے بعد یہاں یکے بعد دیگرے مملوک، خلجی، تغلق، سید، لودھی، سوری اور مغل حکمران رہے۔ تغلق دور خاص طور پر ملتان کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں یہاں عظیم المرتبت بزرگانِ دین کا قیام تھا۔ حضرت بہاء الحق زکریاؒ، شاہ رکن عالمؒ، حضرت شمس الدین تبریزیؒ، حضرت شہد نا شہیدؒ (شاہ دانا شہید) اور حضرت شاہ یوسف گردیزیؒ ملتان کے قدیم اولیائے کرام میں سرفہرست ہیں۔

1334ء میں المغرب کا مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ ملتان آیا اور یہاں کے حالات اپنے سفر نامے میں تحریر کیے۔ 1443ء میں ایک مقامی قوم لنگاہ کی حکومت ہوئی جو 79 سال تک قائم رہی۔ 1541ء میں شیر شاہ سوری نے ملتان کا انتظام سنبھالا۔ اس نے کئی عمارتوں کی مرمت کروائی اور اسی کے عہد میں ملتان، لاہور، ملتان دہلی شاہراہ تعمیر ہوئی۔ مغلوں کے دور میں ملتان نے زبردست ترقی کی۔ اسے مغل دستاویز میں دارالامان لکھا جاتا رہا ہے۔ شاہ جہاں نے صوبہ ملتان شہزادہ مراد بخش کو ذاتی جاگیر میں دیا تھا۔ شہزادہ مراد بخش نے شہر کے بڑے حصے کو از سر نو تعمیر کرنے کا حکم دیا اور لاہوری دروازے کے سامنے شہر پناہ سے متصل خندق پر ایک پل تعمیر کیا گیا۔ مغل فرمانروا فرخ سیر کے عہد میں ملتان اور لاہور کے صوبدار نواب عبدالصمد خان بہادر دلیر جنگ نے ملتان کی حسین و جمیل عیدگاہ تعمیر کرائی۔ یہ عمارت ملتان کی روائتی روغنی ٹائلوں، مقامی دستکاری اور مغل فن تعمیر کے اعلیٰ ترین معیار کو یکجا کرتی ہے، اور آج بھی خوبصورتی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ مغلوں کے زوال کے بعد نادر شاہ افشار نے ملتان کو ایرانی حکومت کا حصہ بنالیا۔ کچھ عرصہ بعد 1752ء میں احمد شاہ ابدالی نے قندھار سے آکر ملتان پر قبضہ کرلیا اور یہاں اپنا حاکم مقرر کردیا۔

1758ء میں مرہٹوں نے سر اٹھایا اور ملتان پر حملہ آور ہوئے۔ 1761ء میں احمد شاہ ابدالی نے دوبارہ حملہ کیا اور شجاع خاں سدوزئی کو یہاں کا گورنر مقرر کیا۔ سدوزئی خاندان 1818ء تک ملتان پر حاکم رہا۔ کئی مرتبہ ناکامی کے بعد رنجیت سنگھ کی افواج نے دیوان چند کی قیادت میں ملتان پر حملہ کیا۔ نواب مظفر خان نے دلیری سے دفاع کیا اور بالآخر قلعے میں لڑتا ہوا شہید ہوگیا۔ 1848ء تک ملتان پر سکھوں کا قبضہ رہا اور پھر 20 دسمبر 1848ء کو انگریزوں نے شدید گولہ باری اور قلعہ کی تباہی کے بعد شہر پر قبضہ کرلیا۔ تقریباً ایک سو سال ملتان انگریزوں کے زیر حکومت رہا۔ یہاں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ نئی نئی عمارتیں، باغ اور سڑکیں تعمیر ہوئیں۔ چھاؤنی اور سول لائنز کا علاقہ آباد ہوا۔ لاہور، کراچی ریلوے لائن کا منصوبہ مکمل ہوا اور

اس طرح ملتان کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

14 اگست 1947ء کو پاکستان معرض وجود میں آیا تو ملتان اس لحاظ سے بے حد اہم مقام تھا کہ یہ مغربی پاکستان کے تقریباً مرکز میں واقع ہے اور اپنی تاریخی و جغرافیائی حیثیت سے سرحد (پختونخوا)، بلوچستان، پنجاب اور سندھ کی تجارت، ثقافت اور آمد و رفت کے لیے یکساں طور پر اہم ہے۔ یہاں صنعت و حرفت اور زراعت میں ترقی کے لئے وسائل و اسباب موجود ہیں۔ مختلف ذرائع رسل و رسائل بھی ملتان ہی سے کنٹرول کیے جاتے ہیں۔ قومی شاہراہ اور ریلوے لائن، ہوائی راستہ۔ الغرض ہر لحاظ سے ملتان ایک پڑاؤ ہے۔ پشاور، کراچی روٹ پر یہ مقام تقریباً درمیان میں واقع ہے۔ کم و بیش یہی معاملہ لاہور اور کوئٹہ کے حوالے سے بھی ہے۔ چنانچہ ملتان ہمیشہ کی طرح آج بھی ایک زندہ اور فعال شہر کی حیثیت رکھتا ہے۔

ملتان کے عظیم ثقافتی و فنی ورثے میں یہاں کی تاریخی عمارتیں قابل ذکر ہیں۔ ملتان میں لاہوری دروازے کے نزدیک سطح زمین سے تقریباً پچاس فٹ بلند ایک ٹیلہ ہے۔ اس ٹیلے پر جسے عام طور پر قلعہ کہا جاتا ہے کہیں کہیں فصیل کے نشانات موجود ہیں۔ راقم الحروف نے اس ٹیلے پر کئی جگہ مٹی کے برتنوں کے ٹھیکرے اور اینٹوں کے ٹکڑے دیکھے (1970ء) جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ ٹیلہ قدرتی نہیں بلکہ کسی برباد شدہ بستی کا ملبہ ہے۔ اس ٹیلے یا قلعے پر ملتان کے مشہور صوفی اور بزرگ شاہ رکن عالمؒ کے مزار کے نزدیک ایک جگہ محمد بن قاسم کے زمانے کی جامع مسجد کے آثار ملے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ قدیم زمانے سے سطح زمین سے اونچی اور ٹیلے کی شکل میں ہے۔ ہوسکتا ہے کھدائی ہونے پر یہاں ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے زمانے کی آبادی کے آثار ملیں۔ بہر حال ملتان میں موجود قدیم ترین عمارت بوہڑ گیٹ کے اندر حضرت شاہ یوسف گردیزیؒ کا مزار مقدس ہے جو 1150ء میں تعمیر کیا گیا۔ قلعہ کہنہ میں واقع پر ہلاد پوری مندر اگرچہ انگریزوں اور سکھوں کے دور کی تعمیر ہے۔ تاہم اس مندر کا وجود اس جگہ بہت قدیم ہے اور اس کی بنیاد ابھی تک اسی جگہ ہے جہاں مسلمانوں کی آمد سے پہلے تھی۔

ملتان میں فن تعمیر کے اچھوتے نمونے ملتے ہیں۔ شاہ یوسف گردیزیؒ کے مزار کی خصوصیت ملتان کے مشہور نیلے آسمانی اور سفید روغنی ٹائل ہیں جنہوں نے پوری عمارت کو ڈھانپ رکھا ہے۔ یہ ایک مستطیل عمارت ہے۔ اس کی چھت ہموار ہے۔ مزار کے گرد و پیش بہت سی قبریں ہیں جو خاصی پرانی ہیں۔ شہر میں جا بجا ٹائل سے سجائی گئی عمارتیں نظر آتی ہیں۔ پرانے مزاروں اور مسجدوں کی کثرت ہے۔

شاہ رکن عالمؒ کا مزار ملتان کے فن تعمیر کی معراج ہے۔ یہ تغلق عہد کی یادگار ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ مقبرہ سلطان دہلی غیاث الدین تغلق نے اپنی تدفین کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ جب غیاث الدین ناگہانی طور پر ہلاک ہو گیا اور دہلی میں دفن کیا گیا تو اس کے جانشین محمد تغلق نے شاہ رکن عالمؒ کا تابوت اس عمارت میں منتقل کر دیا۔ یہ عظیم الشان عمارت فرش سے کوئی سو فٹ بلند ہے اور تقریباً پندرہ میل دور سے نظر آتی ہے۔ عمارت کی بنیاد ہشت پہلو ہے اور تیرہ فٹ موٹی دیوار پختہ اینٹوں سے چنی گئی ہے۔ زاویوں پر گول پشتارے ہیں جن پر گنبد بنائے گئے ہیں۔ دیوار کی چنائی میں لکڑی بھی استعمال کی گئی ہے اور تین چار فٹ کے بعد ایک حلقہ لکڑی کے شہتیروں کا ہے۔ عمارت میں لکڑی کے اس انداز میں استعمال کی دو وجوہات ہیں، ایک تو ان کی موجودگی سے عمارت کا وزن زمین پر یکساں پڑتا ہے اور دیواروں میں دراڑیں اور شگاف نہیں آتے، دوئم یہ زلزلے کی کیفیت میں عمارت کا دفاع کرتی ہیں۔ چنانچہ صدیاں گزرنے کے باوجود اس عمارت کی پختگی میں فرق نہیں آیا اور یہ آج بھی ملتان کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ شاہ رکن عالمؒ کا مزار نہایت خوبصورتی اور فنکارانہ چابکدستی سے سجایا گیا ہے۔ نیلے آسمانی اور سفید ٹائل آج بھی نئے معلوم ہوتے ہیں اور ملتان کی چمکتی ہوئی دھوپ میں دور سے نظر آتے ہیں۔ اردگرد کی خاک اور زردی مائل فضا میں نیلا رنگ بے انتہا پرکشش اور واضح نظر آتا ہے۔ یہ ٹائل خوبصورت بیل بوٹوں اور اقلیدسی نمونوں سے مزین ہے۔ ان میں ابھرے ہوئے نقش و نگار بھی ملتے ہیں جو ایک نادر روزگار صنعت ہے۔ مزار کی بیرونی اور اندرونی دیوار کو اینٹوں میں بنے ہوئے نقش و نگار سے بھی سجایا گیا ہے۔ نہایت نفاست سے آیات قرآنی اینٹوں میں تراشی گئی ہیں اور ان تمام چیزوں کا مجموعی تاثر بے انتہا دلفریب ہے۔ مزار کے اندر لکڑی پر کندہ بیل بوٹے اور قرآنی آیات نظر آتی ہیں۔ یہ آیات خط کوفی میں لکھی گئی ہیں۔ چھے سات سو سال پرانی دستکاری آج بھی دیکھنے والوں کو مسحور کر دیتی ہے۔

شاہ رکن عالمؒ کا مزار فن تعمیر کے لحاظ سے برصغیر پاک و ہند کی بہترین عمارتوں میں سے ہے بلکہ یہ کہنا بجا ہے کہ اگر تاج محل مغلوں کے عہد کا عجوبہ اور شاہکار ہے تو یہ مزار سلاطین دہلی کے عہد کا سب سے جامع اور حسین مرقع ہے۔ اس کا عظیم الشان گنبد جس کی بیرونی پیمائش کوئی 68 فٹ ہے۔ ملتان شہر کے افق پر حکومت کرتا ہے۔ مزار کے اندر بھی اس گنبد کے تاثر میں کمی نہیں ہوئی بلکہ یہ عمارت کا سب سے دلچسپ اور اہم عنصر بن گیا ہے۔ ملتان کی شدید گرمی اور آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے والی دھوپ کے بعد جب ایک زائر اس مزار میں داخل ہوتا ہے تو یہاں کی خنک فضا ملگجی روشنی اسے متاثر کیے بغیر نہیں رہتی

یہ روشنی گنبد کے نزدیک واقع چھوٹی چھوٹی محرابوں سے اندر داخل ہوتی ہے اور گنبد سے ٹکرا کر تمام عمارت کو روشن کر دیتی ہے۔ حضرت رکن عالمؒ کا مرقد فرش سے کوئی تین فٹ بلند ہے، اس مقام پر ایک چھتری (کنوپی) کا اضافہ بعد میں کیا گیا ہے جو عمارت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ مغرب کی جانب دیوار میں ایک محراب بنی ہے جس پر لکڑی کا کام ہے۔ یہاں خط کوفی میں آیت الکرسی کندہ ہے۔ محراب میں چوب کاری کے علاوہ اینٹ کو تراش کر خوب صورت نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ اسی دروازے سے ملحق ایک ڈیوڑھی ہے جو اصل عمارت کے بعد تعمیر کی گئی ہے۔ مزار کے سامنے ایک وسیع صحن ہے۔ شمالی جانب ایک مسجد بعد میں تعمیر کی گئی ہے۔ جنوب مغربی سمت میں بھی ایک چھوٹی سی مسجد ہے جو تغلق دَور کی معلوم ہوتی ہے۔ مزار قلعے کے دیول دروازے سے ملا ہوا ہے۔ یہ دروازہ اب از سرِ نو تعمیر کیا گیا ہے (1970ء) اور قاسم دروازہ کہلاتا ہے۔ قلعہ کہنہ کے اس علاقے کو ایک سیر گاہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور اس کا نام محمد بن قاسم فاتح سندھ اور ملتان کے نام پر قاسم باغ رکھا گیا ہے۔

اس باغ سے مشرق کی جانب آئیں تو حضرت بہاالدین زکریاؒ کا مزار ہے جو بڑی حد تک شاہ رکن عالمؒ کے مزار سے مشابہ ہے لیکن اس کی بنیاد چوکور ہے دوسری منزل ہشت پہلو ہوگئی ہے جس پر مدور گنبد قائم ہے۔ تمام عمارت پر سفیدی کر دی گئی ہے (1970ء) اور اصل نقش و نگار تلاش کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ 1848ء میں جب انگریزوں نے سکھ فوج پر گولہ باری کی تو اس مزار کو شدید نقصان پہنچا۔ اس کی از سرِ نو تعمیر نے اصل عمارت کی کئی خصوصیات ختم کر دی ہیں۔ اس مزار کے احاطے میں نواب مظفر خان والیٔ ملتان کا مرقد ہے جو سکھوں سے جنگ میں اس انداز سے شہید ہوئے کہ دونوں ہاتھوں میں شمشیر ہائے برہنہ موجود تھیں۔ مزار سے ملحق کہنہ کا اونچا ٹیلہ ختم ہو جاتا ہے اور اسی جانب تھوڑے فاصلے پر حضرت شمس تبریزیؒ کا مزار ہے جو ملتان کی قدیم عمارت سازی اور روغنی ٹائل کے استعمال کا ایک شاہکار ہے۔ یہاں ٹائلوں کا کام نہایت خوبصورتی اور ہنر مندی سے کیا گیا ہے۔ مزار کا گنبد سبز رنگ کا ہے اور دور سے نظر آتا ہے۔ طرز تعمیر حضرت بہاالدین زکریاؒ کے مزار سے ملتی جلتی ہے۔

ان مزاروں کے علاوہ بھی ملتان کے قدیم علاقوں میں عالی مرتبت بزرگانِ دین کے مزار ملتے ہیں۔ ٹائل سے مزین خوبصورت مسجدوں کی کثرت ہے اور یہ مختلف ادوار سے تعلق رکھتی ہیں۔ تغلق، سید، لودھی، سوری اور مغل عہد کی بے شمار عمارتیں ملتان میں موجود ہیں لیکن ان سب میں عید گاہ ملتان خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ نسبتاً نئے دور کی یادگار ہے۔ عید گاہ نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ حاکم لاہور اور ملتان

نے مغل شہنشاہ فرخ سیر کے عہد میں تعمیر کرائی تھی۔ اس سے پہلے شہنشاہ اکبر کی فتح پور سیکری اور آگرہ میں جامع مساجد، شاہجہان کے دور کی جامع مسجد دہلی اور اورنگ زیب کے عہد میں بادشاہی مسجد لاہور موجود تھیں اور ان کے فن تعمیر نے ملتان کی عید گاہ کو خاصا متاثر کیا ہے۔ یہاں بھی مسجد کے دونوں کونوں پر مینار تعمیر کیے گئے ہیں اور ایوان مسجد کا صدر دروازہ باقی عمارت سے بلند ہے۔ مغل دور کی دیگر مساجد کے برعکس یہاں صرف ایک درمیانی گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔ جبکہ دہلی، آگرہ یا لاہور کی مساجد میں تین گنبد تعمیر کیے گئے ہیں۔ ملتان کی مشہور روغنی ٹائلیں نہایت خوبصورتی سے استعمال کی گئی ہیں اور انہیں جوڑ جوڑ کر عمدہ بیل بوٹے، اشعار اور آیات قرآنی کے سلسلے تیار کیے گئے ہیں۔ یہ بات بڑی اہم اور دلچسپ ہے کہ پاکستان میں مغل دور کی یہ واحد اور برصغیر پاک وہند کی سب سے پہلی عمارت ہے جہاں اردو اشعار بھی لکھے گئے ہیں۔ اندرونی سطحوں پر رنگوں سے نقش ونگار بنائے گئے ہیں لیکن ملتان کے گرم موسم کو مدنظر رکھتے ہوئے ہلکے ہلکے آبی رنگ استعمال کیے گئے ہیں اور مجموعی تاثر سبز اور نیلگوں ہے۔ اس عمارت کی بیرونی دیوار جس سلیقے اور ہنرمندی سے سجائی گئی ہے، وہ مغل فن تعمیر کی خصوصیت ہے۔ ملتانی روغنی ٹائلوں کی زیبائش سے مزین اس سے بہتر عمارت ملنی مشکل ہے۔ تمام دیوار مصور کا مرقع یا زرنگار کتاب کا صفحہ نظر آتی ہے۔ یہ زیب وزیبائش اتنی پرکشش اور تروتازہ ہے کہ مسجد کی کہنگی کا خیال بھی نہیں آتا۔ عید گاہ ملتان کے قدیم شہر سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر ہے اور کسی زمانے میں ویران جگہ میں واقع ہوگی۔ ایوان مسجد کے سامنے ایک جگہ سیاہ پتھر کی سلوں سے فرش بنایا گیا ہے اور اس کے بعد صحن میں گھاس کے قطعات درخت اور فوارے ہیں۔ ملتان کے فن تعمیر کی یہ آخری تاریخی یادگار ہے جس کے بعد یہاں خلفشار اور تباہی کا ایک دور آیا۔ سکھ حکومت کے دوران یہاں بہت سی حسین عمارتیں مسمار کردی گئیں۔ انگریزوں نے نئی آبادیوں کی جانب توجہ دی اور اس طرح شاہ یوسف گردیزی کے مزار سے نواب عبدالصمد کی عید گاہ تک ملتان کے فن تعمیر کی ایک زندہ تاریخ ابھی تک موجود ہے۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ جو طرز تعمیر ملتان سے وابستہ کیا جاتا ہے، وہ مسلمانوں کی آمد پر شروع ہوا۔ روغنی ٹائلیں اس کا سب بڑا مظہر ہیں اور آج تک وہ ملتان کا نشان سمجھی جاتی ہیں لیکن یہ طرز تعمیر ہمیشہ سے صرف مسلمانوں کی عمارتوں سے وابستہ رہا۔ غیر مسلموں کی بنائی ہوئی عمارتوں میں نہ تو ان دستکاریوں کو جگہ دی گئی اور نہ ہی انہیں اپنا سمجھا گیا چنانچہ ملتان کی مسجدوں اور مزاروں میں آج بھی ان تاریخی اور روائتی عناصر کو شامل کیا جاتا ہے جبکہ دیگر مذاہب کی عمارتوں میں ان کے لئے جگہ نہ بن سکی۔ ملتان کا مقامی

فن تعمیر دراصل ملتان کا اسلامی طرز تعمیر ہے جو تاریخ کے مختلف ادوار میں چند اقدار کی حفاظت کرتا آیا ہے۔موجودہ دور میں اگر چہ اس پیمانے کی آرائش کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔تاہم عوامی ذہن میں حسن اور ترتیب کا ایک مخصوص تصور جا بجا اظہار کا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ملتان حسین عمارتوں کا شہر اور فن تعمیر کی ایک مکمل نمائش گاہ ہے۔دور جدید میں تعمیر ہونے والی عمارتوں کو اسی بلند معیار کا ہونا چاہیے تھا لیکن نشتر میڈیکل کالج، ریلوے اسٹیشن اور دیگر نجی اور سرکاری عمارتیں دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ملتان میں جدید فن تعمیر کے لحاظ سے کوئی اہم کام نہیں ہوا۔ملتان کی بلدیہ عوام اور پاکستان کے ماہرین فن تعمیر کا فرض ہے کہ وہ پیش قدمی کریں اور اس خوبصورت شہر میں فن وثقافت کے حوالے سے قدیم وجدید کے ایک اعلیٰ امتزاج کی روایت کو آگے بڑھائیں۔

○

پاکستان کے لیے مقامی اور غیر ملکی سیاحت کی اہمیت

پاکستان اقتصادی طور پر ترقی پذیر ملک ہے۔ یہاں وسائل کو پوری طرح زیر استعمال لانے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہماری قومی زندگی میں افراد کی معاشی اور معاشرتی ترقی بھی شامل ہونی چاہیے، اسی لیے ترقیاتی منصوبہ بندی میں ثقافتی اور معاشرتی فوائد بھی مدنظر رکھے جاتے ہیں اور بعض مالی امور نظر انداز بھی کیے جاتے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ سیاحت، معاشرتی اور اقتصادی دونوں اعتبار سے ایک منعفت بخش شعبہ ہے۔ پاکستان میں سیاحت کی ترقی ہماری قومی یک جہتی، ثقافتی ورثے کی حفاظت اور تعلیم وتربیت کی سہولتوں میں اضافے کا باعث ہے۔ عالمی پس منظر میں بھی ہمارے ملک کے لیے سیاحت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ہمیں خارجی تعلقات اور تجارتی توازن قائم رکھنے کے لیے اپنی صلاحیتوں اور وسائل کو فروغ دینا ہے۔ ملکی اور غیر ملکی سیاح، محبت اور امن کے سفیر ہوتے ہیں۔ ایک سیاح بہت کچھ دیکھتا اور سیکھتا ہے اور اپنے تجربے کو آگے پھیلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ قدیم سے سیاحت کو ایک باوقار اور پرکشش حیثیت دی گئی ہے۔ کاروان سرائے، قہوہ خانے، داستان گو، سفرنامے اور تاریخی مقامات ابھی تک ہماری ثقافت اور فن و ادب کا حصہ ہیں۔ ہیون سانگ، مارکو پولو، ابن بطوطہ اور واسکوڈے گاما شاید بچپن سے ہمارے ساتھ ہیں اور ان کی سیاحت میں ہمیں اپنی فطری خواہش دشت نوردی کی جھلک نظر آتی ہے۔ سیاح اب بھی ایک مشکل پسند اور روزمرہ کے معمولات سے بھاگا ہوا انفرادیت پسند سمجھا جاتا ہے۔ یہی خصوصیات آج کل کے مشینی دور میں انسانیت کے بنیادی عنصر تجسس کو نایاب ہونے سے بچائے ہوئے ہیں۔

ملکی اور غیر ملکی سیاح اس ملک میں دلکش اور ناقابلِ فراموش سیاحتی وثقافتی تجربات کی کمی محسوس نہیں کریں گے۔ پاکستان کی سیاحتی اہمیت کو درج ذیل نکات سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے:

1- پاکستان کی نظریاتی بنیاد کی حفاظت اور تشہیر۔

2- اسلامی طرز حیات کی نمائندگی۔

3- ثقافتی ورثے کی نگہداشت اور ترقی۔

4- علاقائی اور صوبائی یک جہتی و ہم آہنگی۔

5- ملکی وسائل کی ترقی۔

6- خارجی تعلقات میں پاکستان کے لیے خیر سگالی کا فروغ۔

7- سیر و تفریح کی سہولتوں میں اضافہ۔

8- قدرتی اور شہری ماحول کی حفاظت۔

9- تعلیم و تربیت کے لیے سہولیات۔

10- سرمایہ کاری کے نئے مواقع اور زر مبادلہ کا حصول۔

1- پاکستان کی نظریاتی بنیاد کی حفاظت اور تشہیر

پاکستان ہمارے بزرگوں کا ورثہ ہے اور اس کی اساس ایک نظریے پر قائم ہے۔ پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک نیا نام ہے، اسے جو پہچان ہم دینا چاہتے ہیں وہ سیاحتی اعتبار سے بھی اہم ہے۔ یہاں کا ماحول اور معاشرت اپنی مخصوص ممکنات اور حدود کے ساتھ توجہ کے قابل ہیں۔ اس پہلو کو ہم پاکستان کی انفرادی خصوصیت اور کشش بھی بنا سکتے ہیں۔ ہمارے لیے قومی وقار اور ایک نظریے کو عملی طور پر کامیاب بنانے کے لیے جو بھی کوشش ہوگی مقامی اور غیر ملکی سیاح اسے اپنے نظری اور فکری تجربے کا حصہ بنائے گا۔ ایسی تمام علامات اور قومی زندگی میں پیش آنے والے واقعات سیاحتی دلچسپی کے فروغ کا باعث ہوتے ہیں۔ پاکستان میں خصوصی اہمیت کے حامل مقامات اور واقعات کی تفصیل بہت طویل ہے لیکن چند اہم باتیں یہاں بیان کی جاسکتی ہیں۔

قومی تاریخ کے اہم مقامات اور یادگاریں ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔ ہماری تاریخ کے اہم فیصلے اور قومی رہنماؤں سے وابستہ یادگار مقامات مقامی اور غیر ملکی سیاحوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً مینار پاکستان لاہور ہماری جدوجہد آزادی اور آہنی عزم و ارادے کا مظہر ہے۔ اسلام آباد ایک آزاد مملکت کے لیے نئے دارالحکومت کی ضرورت کا نتیجہ ہے۔ جلو موڑ پر جنگ 65ء کی یادگاریں، لاہور کی مسجد شہداء اور مختلف شہروں اور شاہراہوں کے نام اپنے شہداء پر رکھنے سے ہماری جرات و شجاعت

کی داستانوں کو اظہار کا ذریعہ ملا ہے جو ملکی تحفظ کے لیے ہمارے سرفروش بار بار پیش کر سکتے ہیں۔ مزار قائداعظم، مزار اقبال، اولیائے دین کے مراقد مقدسہ، درگاہیں اور اسلامی تعلیمات کے ادارے ہمارے قومی اور مذہبی رجحانات کا اظہار ہے۔ اسی طرح وزیر مینشن، جاوید منزل، سیالکوٹ میں علامہ اقبال کا آبائی مکان، راولپنڈی کا لیاقت باغ اور لائبریری، اکوڑہ خٹک میں خوشحال خاں کی یادگار، ست گھرہ (نزد اوکاڑہ) میں احمد خاں کھرل کا مزار، قصہ خوانی بازار پشاور میں شہداء کی یادگار اور زیارت میں قائداعظم کی آخری دنوں کی رہائش گاہ ایسے مقامات ہیں جو ہماری قومی تاریخ کے سنگ میل کہے جا سکتے ہیں۔

پاکستان کی نظریاتی بنیاد کو اجاگر کرنے کے لیے بہت سے اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ ہمارے ملک کے ہر علاقے میں پاکستان کے حصول کے لیے قابل قدر جدوجہد کی گئی تھی۔ اس جدوجہد کو باعث افتخار سمجھتے ہوئے ہمیں مقامی سطح پر یادگاریں قائم کرنی چاہئیں۔ قومی قائدین نے پاکستان بنانے کے ہراول دستے کو جہاں جہاں خطاب کیا تھا وہ مقامات قومی اہمیت کے حامل ہیں۔ مستقبل میں ایسی یادگاریں پاکستان کے تمام ضلعی صدر مقامات میں قائم کی جانی چاہئیں۔

پاکستان کے استحکام اور ترقی کے لیے کیے جانے والے مختلف اقدامات سیاحت کے فروغ کے لیے معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس ضمن میں قائداعظم اور دوسرے اکابرین ملت کے یادگار دن، راولپنڈی/اسلام آباد میں منعقد ہونے والی سالانہ پیریڈ، خصوصی تقریبات، ڈاک کے یادگاری ٹکٹ، یادگاری سکے اور میڈل، یادگاری تعمیرات، پارک اور دیگر اقدامات سیاحت میں فروغ کے اعتبار سے اہم عناصر ہیں۔

2-اسلامی طرز حیات کی نمائندگی

پاکستان بنیادی طور پر ایک اسلامی معاشرہ ہے۔ سیاحت کے نقطہ نظر سے کسی ملک کی طرز زندگی خصوصی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں جاپان کی مثال ہمارے لیے خاصی اہم ہے۔ مغربی اقدار کو اپنانے کے باوجود جاپان کی منفرد دلکشی وہاں کی طرزِ زندگی اور فنون کی وجہ سے ہے۔ پاکستان میں برصغیر کے مخصوص اثرات کے ساتھ ساتھ اسلامی اقدار کی حفاظت ایک شاندار تہذیبی روایت کا تسلسل ہے۔ ہمارے مذہبی تہوار اور رسومات غیر ملکی سیاحوں کو پاکستان بلانے کا سبب بن سکتے ہیں۔ اسلامی رواداری اور مہمان نوازی بھی ہمارے لیے بہت بڑے وسائل ہیں۔ اسلامی طرز حیات کے چند دلچسپ

پہلو ہمارے بزرگان دین کے سالانہ عرس، رمضان، عید، شب برات، محرم، عید میلادالنبیؐ، شادی بیاہ کی تقریبات، قوالی اور نعتیہ مقابلے، مشاعرے اور میلاد کی محفلیں ہیں۔ مغربی ممالک سے سیاحوں کے علاوہ اب مشرق وسطیٰ کی نئی نسل بھی مالی وسائل کے لحاظ سے اتنی اہم ہے کہ دنیا بھر میں سیاحت کی ترقی کے لیے منصوبہ بندی میں اس علاقے سے آنے والے سیاحوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان میں اسلامی روایات کی جو شکل سامنے آتی ہے وہ ان سیاحوں کے لیے خصوصی دلچسپی کا باعث ہوگی۔ سیاحت میں فروغ سے ہمارے لیے جہاں اقتصادی فوائد ہیں، وہاں اپنے ہمسایہ ممالک سے بہترین تعلقات کے لیے جو خیر سگالی اور انسیت کے جذبات عوامی سطح پر درکار ہیں، اس کے لیے پاکستان آنے والا ہر سیاح ایک سفیر کا کام دے سکتا ہے۔

3- ثقافتی ورثے کی نگہداشت اور ترقی

پاکستان کے عظیم ثقافتی پس منظر میں ہمیں اپنے ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنے اور اسے اپنے فنون کی ترقی میں بنیادی درجہ دینے کے لیے ایک بہت بڑے منصوبے کے تحت کام کرنا ہے۔ سیاحت اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ پاکستانی سیاح اپنے ملک سے بہتر طور پر واقف ہو کر اس ثقافتی ورثے کو کئی سطح پر روشناس کرا سکتے ہیں۔ علاقائی اور صوبائی یک جہتی بھی اسی ثقافتی ورثے کی مشترکہ اقدار سے بڑھائی جا سکتی ہے۔ پاکستان کے ادیب، شاعر، فنکار اور دیگر افراد اپنے ملک کی خوبصورت اور منفرد دستکاریوں، عمارات، مناظر قدرت اور فن پاروں سے آگاہ ہو کر ہماری قومی شناخت کو اجاگر ہونے میں مدد دیں گے۔ غیر ملکی سیاح اپنے ساتھ بہت سی خوشگوار یادیں اور ہماری ثقافتی اقدار سے دوستانہ رویہ لے کر جائیں گے۔ وفاقی اور صوبائی سطح پر ثقافتی ورثے کے تحفظ کے لیے جو کوشش کی جاتی ہے اسے سیاحت کے فروغ سے مربوط کر دینے میں بہت سے مالی وسائل بھی حل کیے جا سکتے ہیں۔ تاریخی عمارات کی مرمت اور حفاظتی اقدام کے لیے جو منصوبہ بندی اور سرمایہ درکار ہوتا ہے وہ غیر منفعت بخش ہونے کی وجہ سے عموماً حکومت کے لیے ''غیر ضروری'' اخراجات کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ سیاحت ایک صنعت ہونے کی وجہ سے ایسے اقدام کو منفعت بخش سرمایہ کاری میں تبدیل کر سکتی ہے۔ لاہور کے قدیم علاقے (اندرون شہر) کی حفاظت اور ترقی کے لیے جو منصوبہ شروع کیا گیا ہے، اسے منفعت بخش بنانے کے لیے بھی سیاحت کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ غیر ممالک میں ایسی بہت سی کامیاب مثالیں موجود ہیں

جہاں ثقافتی اور معاشرتی افادیت کے منصوبے سیاحت میں اضافے کا باعث ہوئے ہیں۔ ان منصوبوں پر لگا ہوا سرمایہ مالی طور پر مفید منصوبہ بندی کی مثال ہے۔ حال ہی میں نکوسیا (قبرص) کے قدیم شہر کو سیاحوں کی دلچسپی کے مرکز میں تبدیل کیا گیا ہے حالاں کہ یہ علاقہ معاشرتی اور اقتصادی طور پر پسماندگی اور خستہ حالی کا شکار تھا۔ مالی فوائد غیر یقینی ہونے کی وجہ سے سرمایہ کاری بھی مشکل تھی۔ سیاحت کو مدنظر رکھتے ہوئے جو سرمایہ کاری کی گئی وہ معمول کے مطابق مرمت اور تنظیم کے اخراجات کے لیے رقم مختص کرنے کے بعد واجب الادا ہوگی۔

4-علاقائی اور صوبائی یک جہتی

مقامی اور غیر ملکی سیاح عموماً خوشی اور امن کے پیامبر ہوتے ہیں۔ افہام و تفہیم کا جو موقع سیاحت فراہم کرتی ہے وہ کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں۔ مقامی سیاحت سے علاقائی اور صوبائی طور پر ہم ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہوں گے اور پاکستانی ہونے پر فخر اس ملک کو دیکھ کر ہی ہوتا ہے۔ ہمارے وسائل، ہماری مشکلات، ہمارے ارادے اور ہمارے مستقبل کی امیدیں پاکستان سے پوری طرح روشناس ہوئے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ علاقائی غلط فہمیاں اور افواہیں اپنے ملک کے لوگ اور ان کے حالات دیکھ کر خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ ہمارے مسائل مشترکہ ہیں تو ان کے حل بھی ہمارے ملے جلے اقدام ہوں گے۔ دریائے سندھ کی پانی کی تقسیم کا مسئلہ ایک مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے کسی بھی حصے کے رہنے والے سیاح کے لیے مختلف علاقوں کی زمینی ساخت، پیداواری صلاحیت، اشیائے صرف کی نقل وحرکت، مختلف قدرتی اور اقتصادی حقائق، ذاتی مشاہدے کے باعث کسی نظریہ کو صحیح یا غلط ماننے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ایک سیاح اپنے ملک کے ہمہ گیر فائدے کو فوقیت دینے میں پس و پیش نہیں کر سکتا۔ غیر ملکی سیاح کے ساتھ اپنے ہم وطن کا موازنہ کرتے وقت بھی پاکستانی قومیت کی اہمیت اور ضرورت کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔ پاکستانی کی پہچان اسی وقت ہو جاتی ہے جب غیر ملکی سیاحوں سے اپنے ملک کا ذکر کرتے وقت پنجابی، پٹھان، بلوچ، سندھی یا کشمیری کی اصطلاحات ترک کرنی پڑتی ہیں۔ غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں ہماری ایک ہی پہچان رہ جاتی ہے جو پاکستان کے شہری کی ہے۔

5- ملکی وسائل کی تشہیر و ترقی

پاکستان کی اقتصادی، زرعی، صنعتی اور معاشرتی ترقی کو مقامی اور غیر ملکی سیاحوں کے ذریعہ

مناسب تشہیر دی جاسکتی ہے۔ بلاواسطہ طور پر ہماری کامیابیوں اور منصوبوں کی تشہیر مستقبل میں اعتماد پیدا کرتی ہے۔ پاکستان قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ اور انہیں ترقی کے مختلف مراحل سے گزارنے کے لیے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ مقامی سیاحت کو فروغ دینے سے ان وسائل کے فائدہ اٹھانے کی قومی خواہش میں مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ سیاحت کے فروغ کے لیے ذرائع نقل وحمل میں ترقی اور بنیادی ضروریات کی فراہمی ضروری ہو جاتی ہے۔ اس طرح بہت سے نئے وسائل دریافت ہوتے ہیں اور اقتصادی طور پر سود مند نہ ہونے والے منصوبے بھی اس ترقی کی وجہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پاکستان کے شمالی علاقوں میں خصوصی طور پر سیاحت کے فروغ کے ساتھ ساتھ معدنیات اور زراعت کے میدان میں قابل قدر ترقی ہوئی ہے۔ غیر ملکی سیاح ہمارے عظیم منصوبوں مثلاً تربیلا اور منگلا ڈیم، دریائے سندھ کے طاس کی نہروں کے نظام، اسلام آباد، شاہراہ قراقرم، پورٹ قاسم اور پاکستان سٹیل ملز وغیرہ سے ہماری گزشتہ کامیابیوں اور مستقبل کے منصوبوں کا بہتر اندازہ لگا سکتے ہیں۔

6- خارجی تعلقات میں پاکستان کے لیے خیر سگالی کا فروغ

مقامی سیاح جہاں علاقائی اور صوبائی یک جہتی کے لیے کام کرتے ہیں وہاں غیر ملکی سیاح ہمارے جذبہ خیر سگالی، مہمان نوازی اور اپنے ملک کے لیے محبت و منصوبہ بندی سے متاثر ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر ان سیاحوں کے ذریعے پہنچی ہوئی آواز بعض اوقات قوموں کی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑ جاتی ہے۔ ہمارے ہمسایہ ملک کی پالیسی اس معاملے میں عیاں ہے اور سیاحت کے فروغ کے ساتھ سیاسی مقاصد بھی مدنظر رکھے گئے ہیں عالمی رائے عامہ اور ذرائع ابلاغ کو اپنے حق میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے لیے بھی ایسے مواقع کی کمی نہیں ہے۔ منصوبہ بندی کے دوران اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے سیاحت کے فروغ کے لیے صرف کی جانے والی رقم کو معاشرتی اور سیاسی فوائد کے حصول کے لیے صحیح سرمایہ کاری ثابت کیا جاسکتا ہے۔

7- سیر و تفریح کے لیے سہولیات میں اضافہ

پاکستان میں تفریحی مقامات اور سہولیات کی بہت کمی ہے۔ شہری اور دیہاتی آبادی کے لیے محدود تفریحی متبادل ہیں۔ اس ضمن میں سیاحت کے لیے قائم کی جانے والی سہولیات اور صحت افزا

مقامات کی ترقی ہمارے ملک کی آبادی کے لیے بھی ایک بہت بڑی نعمت ثابت ہوگی۔

شہری سطح پر تاریخی عمارات، قومی مقامات، باغات، تفریحی پارک، عجائب گھر اور ثقافتی مراکز تفریح کے مقامات خیال کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح شہر سے دور جنگلات، پہاڑی مقامات، نیشنل پارک، پکنک کے لیے مخصوص مقامات ساحل سمندر، دریا اور جھیلیں، قدرتی مناظر وغیرہ مقامی سیاحوں اور چھٹی منانے والوں کے لیے بہت پرکشش ہوتے ہیں۔ سیاحت کے روایتی نظریے سے شاید یہ جگہیں اتنی اہم نہ ہوں لیکن قومی زندگی میں ان کی اہمیت اور غیر ملکی سیاحوں کو ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرانے کی ضرورت کے لحاظ سے تفریحی مقامات بھی سیاحت کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دوسری جانب سیاحت کے فروغ کے لیے جو سہولیات موجود ہوں گی وہ تفریحی سہولتوں میں اضافہ کی ایک صورت ہوگی۔ مثال کے طور پر کراچی کے نزدیک ساحل سمندر کی ہمہ گیر ترقی نہ صرف سیاحت میں فروغ کے لیے ضروری ہے بلکہ کراچی میں رہائش پذیر تمام لوگوں کے لیے سیر و تفریح کے لیے مواقع بھی فراہم کر سکے گی۔

8-قدرتی اور شہری ماحول کی حفاظت

سیاحت کے شعبے میں جو سرمایہ کاری ہوگی وہ بہت سے فوائد کا باعث ہوگی۔ پاکستان کے حوالے سے یہ بہت اہم خصوصیت ہے۔ سیاحت کی ترقی ہمارے قدرتی وسائل پر منحصر ہے۔ یہ حقیقت ہمارے لیے معاشرتی ترقی کے نئے پہلوؤں کی نشاندہی کرتی ہے۔ مونٹے کارلو یا لاس ویگاس کے برعکس پاکستان سیاحوں کے لیے مصنوعی اور تشکیل دی ہوئی دلچسپیوں کا مرکز نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے قدرتی مناظر، تاریخی عمارات اور خوشیاں بانٹنے والے لوگ ہی سیاحوں کے لیے باعث دلچسپی ہو سکتے ہیں۔ ان تمام وسائل کو ترقی دینے کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ قدرتی اور شہری حسن کو قائم رکھنے اور حفاظت کرنے پر مشتمل ہے۔ ہمارے ماحول کو آلودگی سے بچانے اور سیاحوں کے لیے پرکشش رکھنے کے لیے ماحولیاتی منصوبہ بندی کی ضرورت ہوگی جو شہری منصوبہ بندی اور قدرتی ماحول کو تحفظ دینے کے قوانین کے ذریعے ممکن ہے۔ ہمارے خوش نصیبی ہے کہ ماحول سے متعلق ایسے پروگرام زیر غور ہیں اور سیاحت کا شعبہ ان مسائل کو منظر عام پر لانے میں بہت اہم ثابت ہوا ہے۔

9- تعلیم وتربیت کی سہولیات

سفر وسیلہ ظفر ہونے کے علاوہ وسیلہ تعلیم بھی ہے۔ سیاحت کی سہولتیں مہیا ہونے سے ہمارے طالب علموں کو اپنے ملک کی سیاحت کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملیں گے اور تعلیم وتربیت بند کمروں اور کتابوں سے آگے عملی زندگی اور قدرتی حقائق سے نزدیک تر ہو جائے گی۔ نوجوانوں کا جذبہ تجسس اور مہم پسندی بھی سیاحت کے ذریعے تعمیری کوششوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔

شاہراہ ریشم اور درہ خنجراب کے راستے عوامی جمہوریہ چین تک رسائی نے ہمارے نوجوان سیاحوں کے لیے دلچسپی کے نئے مواقع پیدا کیے ہیں۔ سیاحت کی سہولتوں میں اضافہ سے طالب علموں کو اپنے ملک کے دیگر گوشوں سے بھی واقفیت حاصل ہو گی۔ مختلف تعلیمی اداروں کے سیاحتی پروگرام ہر سال ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ تعلیم وتربیت کا پہلو تفریح کے ساتھ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ پاکستان میں بحیرہ عرب کے ساحل سے سلسلہ قراقرم کی برف پوش چوٹیوں تک ہر طرح کے جغرافیائی، تاریخی، معاشرتی، ثقافتی اور سائنسی تجربات ومشاہدات کا حصول سیاحتی سہولتوں کے ساتھ ترقی پذیر ہو سکتا ہے۔

10- سرمایہ کاری کے مواقع اور حصول زرمبادلہ

سیاحت ایک صنعت ہونے کے سبب سرمایہ کاری کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ اس لحاظ سے پاکستان کے لیے بہت سے نئے تجارتی میدان سیاحت کی ترقی سے وابستہ ہیں۔ ہوٹل کی صنعت تو سیاحت سے ہمیشہ وابستہ رہی ہے۔ اس کے علاوہ ٹور آپریٹر کمپنیاں، ایئر لائنز، سفری سہولیات مہیا کرنے والے ادارے، مقامی ٹرانسپورٹ، بینک، دستکاری اور مقامی ہنرمندی کے نمونے فروخت کرنے والے ادارے اور دیگر سیاحتی ضروریات پوری کرنے والی خدمات سرمایہ کاری کے نئے مواقع پیدا کرتے ہیں۔ زرمبادلہ کے حصول میں سیاحت کا جو کردار ہے اسے دنیا کے کئی ملکوں میں اولین درجہ حاصل ہے۔

○

نیشنل کالج آف آرٹس سے نیشنل یونیورسٹی تک

(1972ء)

نیشنل کالج آف آرٹس کو پنجاب یونیورسٹی اور انجینئرنگ یونیورسٹی میں شعبہ وار تقسیم اور ضم کر دینے کی اطلاع ہمارے لیے پریشان کن اور حیرانی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ یہاں دوروزہ غوروخوض کے بعد بھی یہ بحث کسی نتیجے پر اختتام پذیر نہیں ہوئی کہ آخر فنون لطیفہ اور فن تعمیر کے شعبے یونیورسٹیوں میں موجود ہوتے ہوئے لاہور میں ایک الگ ادارے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ چند خیالات جو میں پیش کر رہا ہوں اسی سوال کے چند پہلو اجاگر کرتے ہوئے ایک حتمی نتیجے پر پہنچنے کے لیے حقائق کو ایک جگہ سمیٹنے کی کوشش ہے۔

جب یہ خیالات کسی خاکے کی حدود میں لانے کی جستجو کر رہا تھا تو میرے ذہن میں یہ تصور موجود تھا کہ ہم سب جو نیشنل کالج آف آرٹس سے وابستہ ہیں اور تخلیقی مشاغل و کاری گری میں مشغول رہنے کی وجہ سے نسبتاً زیادہ حساس اور نازک خیالات رکھتے ہیں، موجودہ حالات سے بہت حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ اس ذلت اور شکست سے تعمیر کا پہلو تلاش کریں جو گزشتہ دنوں (1971ء) ہماری قوم اور ہمارے نظریہ حیات کو اٹھانی پڑی۔ معلوم نہیں میں کہاں تک صحیح سوچ رہا تھا لیکن محسوس ہو رہا ہے کہ خود ہماری صفوں میں ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سے عناصر موجود ہیں جو اس وقت اور اس واقعہ کو اہمیت نہیں دینا چاہتے۔ بہر حال یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچانا میرا فرض ہے اور اپنے خیالات کو وقت کی کسوٹی پر چڑھانے سے جہاں ایک طرف شکایتوں اور اعتراضات کے دفتر کھلیں گے وہاں یہ امید بھی ہے کہ ان کی صداقت اور خلوص کی پہچان وقت آنے پر عیاں ہو جائے گی اور یہ مدھم سی آواز جرس کارواں کا کام دے گی۔

اس وقت ہمارے سامنے اس مسئلے کے دو پہلو ہیں۔ایک یہ کہ ہم کیا چاہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ جو چاہتے ہیں وہ کس طرح حاصل کیا جائے۔ براہ کرم ان دونوں پہلوؤں پر غور کیجئے اور اس طرح کی پیچیدگیوں اور نازک خیالیوں میں اپنا وقت اور توانائی ضائع نہ کریں جو ان دونوں پہلوؤں سے تعلق نہیں رکھتیں اور کالج کے داخلی مسائل ہیں۔ یہ صرف ہمارے راستے کی رکاوٹ ہی بن سکتی ہیں اور ان میں الجھ کر قیمتی وقت ہاتھ سے جائے گا۔آپ یہ فیصلہ نہایت آسانی سے کر سکتے ہیں کہ ہماری ترجیحات کیا ہونی چاہئیں۔ جہاں تک میری معروضات کا تعلق ہے، انہیں میں نے دو حصوں میں پیش کیا ہے۔سب سے پہلے تو ان مشکلات اور مجبوریوں کی نشاندہی اور تجزیہ کرنے کی کوشش ہے جو ہمیں درپیش ہیں اور دوسرے حصے میں چند تجاویز ہیں جن کے ذریعے ان مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

چند سال پہلے تک حقیقت یہ تھی کہ ہمارے ادارے نیشنل کالج آف آرٹس میں جو خامیاں ہیں انہیں دور کرنا ہمارا مقصد اولیں تھا۔ یہی سب کچھ تھا اور اس کے علاوہ دنیا کے یا پاکستان کے یا لاہور کے تعلیمی وفنی تربیت دینے والے اداروں میں کیا ہو رہا ہے، اس سے ہمیں کم ہی سروکار تھا۔ طالب علم کی حیثیت سے ہمیں ترجیحات اس طرح مرتب کرنی تھیں کہ نمایاں حیثیت میں کامیاب ہو کر یہاں سے رخصت ہوں۔ معقول ملازمت یا ذاتی کاروبار کے مواقع ملیں اور فنی و پیشہ ورانہ حلقوں میں تعارف و اعزاز کے مستحق بن جائیں۔لیکن آج ہمیں کچھ اور بھی سوچنا ہے۔تنگ نظری اور کوتاہ بینی اس نازک دور میں خودغرضی اور حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ ہم سب قوم کی امانت ہیں۔آپا دھاپی سے کام بنتا نظر نہیں آتا۔ ہم نے اس بدلتے ہوئے زمانے میں بھی یہی انداز جاری رکھا تو سب سے پہلے ہم خود تباہ ہوں گے اور پھر قوم بھی ایک کھوکھلے درخت کی طرح گرنے پر آمادہ ہوگی۔کبھی آپ نے سوچا پاکستان کیوں بنا؟ اور پھر پاکستان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جو کسی قوم کا ذہن ہوتے ہیں، کتنی کم تعداد میں ہیں؟ ان گنتی کے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے مصور اور فنکار کتنے نکلیں گے؟ یہ نہایت مختصر تعداد ہم اور آپ کے اردگرد جانے پہچانے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ چھوٹا سا قبیلہ کسی بھی قوم کے لیے قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ مصور اور فنکار ہی ہوتے ہیں جو قوم کو زندہ رکھنے اور ترقی کرنے کے لیے نئے نئے عزم اور نئی نئی امیدیں فراہم کرتے ہیں۔ یہ خواب دیکھنے اور ان خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے بصری ذرائع پر عبور رکھتے ہیں۔ یہ تعمیری منصوبوں کو اور ماحول کی بہتری کے لیے کیے جانے والے کاموں کی نشاندہی اور انہیں پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے کام سے قوم کی عزت اور وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ میرے خیال میں فنکاروں کی

ذمہ داری ہے کہ اس وقت اپنے فرائض اور پھر حقوق کو بھی پوری طرح سے سمجھیں اور اپنا کردار ادا کریں۔
ایک ترقی پذیر قوم جو دنیا کے لیے ایک مثالی مملکت بن سکتی تھی، اسے اس مقام پر لے آنے میں فن کار بھی بمقدور شامل ہیں۔ ہماری جہاں بانی کی خواہشات اس وقت محکومیت سے بچنے کی تگ و دو میں بدل گئی ہیں۔ ایک ایسی قوم و ملت جس کے سپرد یہ کام کیا گیا ہو کہ ایک دن وہ نسل انسانی کی بے کسی اور بے بسی دور کرے گی اور اس عظیم ورثے کی مالک ہوگی جسے دنیا کے فنی اور ثقافتی خزانے میں قابل رشک سمجھا جائے گا، اس کے لیے اپنی ثقافت اور قومی تشخص کی شناخت ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں فنکار کا مقام کیا ہو سکتا ہے اور ان کی کتنی ضرورت ہے۔ پھر یہ کتنی افسوس ناک خبر ہے کہ یہاں اس ادارے میں جو قوم کے لیے ایک بہت اہم خدمت سرانجام دے سکتا ہے۔ چند ناعاقبت اندیش اس وقت کی آواز سے ناآشنا ہیں اور کوششیں کی جا رہی ہیں کہ یہ ادارہ بند کر دیا جائے۔
یہ وقت تقاضا کرتا ہے کہ ہم پہلے یہ دیکھیں کہ بحیثیت قوم ہم کیا چاہتے ہیں؟ اور پھر یہ کہ قوم کو کس محاذ پر ہم جیسے فنکاروں کی ضرورت ہے تا کہ ہم اپنے آپ کو اس چیلنج کے لیے تیار کر سکیں۔ اس سلسلے میں ہمیں راستے کی کئی رکاوٹوں کو ہٹانا ہوگا۔ اس کو آپ کالج کی از سر نو تشکیل بھی کہہ سکتے ہیں۔ ملازمتوں اور ذاتی کام کی سہولتیں مہیا کرنے کا مطالبہ بھی ہو سکتا ہے اور قومی پالیسی میں اپنا جائز مقام حاصل کرنے کی تحریک بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس امر کا شدت سے احساس ہے کہ یہ پرخلوص عزم و ارادہ ہمارے ذاتی اختلافات اور مفادات کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔ مثال کے طور پر گزشتہ دو دنوں میں یہ مسئلہ بھی اٹھایا گیا کہ جی ہمیں تو نوکریاں نہیں ملتیں، اس لیے کوشش یہ ہونی چاہیے کہ حکومت کی پالیسی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ جب کالج کے شعبے پنجاب یونیورسٹی اور انجینئرنگ یونیورسٹی سے منسلک ہو جائیں گے تو ہمیں ڈپلوما کی بجائے ڈگری ملا کرے گی اور حکومت میں موجودہ نظام کے تحت ملازمتیں آسانی سے مل جایا کریں گی۔ اس مسئلے کا ظاہری چہرہ تو بس یہی ہے لیکن سوچیے آج صوبائی حکومت کی ڈائرکٹوریٹ آف انڈسٹریز کے زیر انتظام نیشنل کالج آف آرٹس کا ڈپلوما، نیشنل ڈپوما کہلاتا ہے۔ پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی کی ڈگری کو یہ اعزاز حاصل نہیں۔ پھر ہمیں اپنا تشخص اسی صورت میں مل جاتا ہے کہ ملازمتیں ڈگری یا ڈپلوما کا فرق نظر آتے ہوئے بھی اکثریت نیشنل کالج آف آرٹس کے فارغ التحصیل فن کاروں کو ہی مل جاتی ہیں۔ ہمارے ثقافتی اور فنی استحصال کی ایک شکل یہ نظام بھی ہے اور سامراجی سازشوں کا ایک روپ یہ بھی ہے کہ فنکاروں میں طبقے پیدا کر دیئے جائیں۔ کیا آپ اب بھی اسی سازشی صورت حال کا شکار رہیں

گے جس نے آج ہمیں ذلیل کر دیا ہے، بھوکا کر دیا ہے، دنیا کی طاقتوں میں سے ہمارا نام مٹا دیا ہے اور آج ہم دنیا کے ایک کونے میں منہ لپیٹ کر آنسو بہانے کے قابل رہ گئے ہیں۔

آخر ہمارے حقوق کے خلاف بات کرنے والے لوگ کون ہیں؟ شاید یہ اپنی سادہ لوحی کے سبب منفی قوتوں کی زبان بولنے لگے ہیں۔ ایسی باتوں سے کیا فائدہ ہوگا؟ آپ یہ نہیں سوچتے کہ ملازمت مل جانا مقصد حیات نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں آرٹ ڈائریکٹر مقرر ہو جانا دراصل ایک بڑے مقصد کا دروازہ کھولنے سے مترادف ہے۔ اپنی جدوجہد کو اسی حصول ملازمت کے لیے وقف کر دینا اور کوشش کا مرکز بنا لینا منفی قوتوں کو سہارا دینا ہے۔ اس سے وہی ہوتا رہے گا جو اب تک ہوتا آیا ہے۔ آپ کا فن اور آپ کا ذہن جو دراصل قوم کی امانت ہے ایک نہ ایک سرمایہ دار کی ملکیت بن کر رہ جائیں گے۔ اس کے ہاتھ زیادہ مضبوط ہوں گے تاکہ وہ پسے ہوئے بے بسوں اور لاچاروں کا مزید خون نچوڑ سکے۔ یہی حالت فن تعمیر کے ماہرین کی ہے جو ابھی تک زبردست جاگیرداروں اور خودغرض صنعت کاروں کے سامنے یس سر، یس سر کرتے رہے ہیں اور تاج محل کھڑے کرتے رہے ہیں۔ آپ ملازمت کرنا ہی چاہتے ہیں تو عوام کی کیجیے، فن کی تخلیق کے لیے اور بھی بہت سی راہیں آپ کی منتظر ہیں۔ ڈگری اور ڈپلوما کا فرق مٹانا چاہتے ہیں تو ضرور مٹائیے لیکن اس لیے نہیں کہ آپ کو کوئی محض اس وجہ سے بڑا فن کار سمجھے گا کہ آپ ڈگری ہولڈر ہیں۔ ہمیں اب کچھ زیادہ چاہیے۔ اس شکم کی غلامی سے آگے کی دنیا بھی سر کرنی ہے۔ قوم کو آپ جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آپ اپنے سامنے جو مشکلات دیکھتے ہیں ان سب کو ختم کرنا ہے تاکہ ہماری تاریخ میں ایک اور 15 دسمبر 1971ء کبھی نہ آئے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ فن کار اگر قوم کی امانت ہے تو قوم کو اس کی ضروریات پوری کرنی چاہئیں۔ ایک فنکار جب تک اپنی ضروریات کے حصول میں سرگرداں رہے گا وہ اپنے آپ کو اور قوم کو دھوکہ ہی دیتا رہے گا۔ انسان کی جائز اور بنیادی ضروریات پوری ہونا چاہئیں اور ان کے لیے ہم حکومت کا تحفظ چاہتے ہیں۔ یہ پیشہ ورانہ ذاتی کاروبار کو قومی سطح پر قانون نافذ کر کے غیر تربیت یافتہ لوگوں کی دست برد سے بچا کر بھی کیا جا سکتا ہے اور ملازمتوں میں توسیع اور اضافے کے ذریعہ بھی بہت سے فن کاروں کو حکومتی سرپرستی مہیا کی جا سکتی ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہونا چاہیے کہ اگر ہم زیادہ حقدار ہیں اور زیادہ مخلص ہیں تو ہمیں مناسب حوصلہ افزائی اور کارکردگی کے لحاظ سے ترجیح ملنی چاہیے۔ ہم یہ سنتے آئے ہیں کہ نیشنل کالج آف

آرٹس کا ایک ہونہار فارغ التحصیل ملازمت کے ایک مقابلے میں صرف اس وجہ سے رہ گیا کہ اس کا مقابل ڈگری یافتہ تھا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اب اس ملک میں صلاحیت اور قابلیت کا راج ہوگا۔ کوئی سفارش نہیں اور کوئی استحصال نہیں۔

اب میں ان تجاویز کی طرف آتا ہوں جو اس مسئلے کے حل کے لیے پیش کی جانی چاہئیں۔ سب سے پہلے ہم نے اپنی قوم کے لیے کچھ کرنا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان نے پاکستان، نظریہ پاکستان اور اس کی تہذیب، ثقافت اور فنون کے بارے میں کس قدر غلط اور منفی انداز میں پروپیگنڈا اسے بین الاقوامی رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کیا ہے۔ گزشتہ چوبیس سالوں میں کوئی دن ایسا نہیں ہوا جب بھارتی سفارت کاروں، فنکاروں، طالب علموں اور دیگر افراد نے غیر ممالک میں اپنے ملک اور اس کی ثقافت کی شہرت اور پاکستان کی بدنامی کے لیے کچھ نہ کیا ہو۔ کبھی روی شنکر کا ستار ہوتا ہے یا کھاجوراہو کے اصنام کی نمائش اور کہا جاتا ہے پاکستان تو بھیڑیوں کا ملک ہے۔ کبھی بھارتی فنکار اور طالب علم مل کر ٹولیوں میں سڑکوں پر ہری کرشنا ہری راما پر ڈانس کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم امن کے پجاری ہیں، پاکستان ہمیں کھا جائے گا۔ وادیء سندھ کی تہذیب پاکستان میں پروان چڑھی لیکن بھارتی سکالر اسے اپنے کھاتے میں لکھنے پر مصر ہیں۔ راگ راگنیاں جو مسلمان موسیقاروں امیر خسرو، میاں تان سین اور سدا رنگ نے تخلیق کیں، انڈین کلاسیکل میوزک پنڈتوں کی جاگیر بنا کر پیش کی جاتی ہے۔ یہ ایک سوچی سمجھی سازش ہے اور اس مقصد ترقی اور روشن خیالی کے سامنے ایک رکاوٹ کھڑی کرنا ہے۔ لیکن یہ بات اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ تاریخ اس سازش اس رکاوٹ کے خلاف فیصلہ دیتی نظر آتی ہے۔ تنگ نظر اور کوتاہ بین قومیں زیر ہوتی آئی ہیں۔ ترقی کا راستہ روکنے والوں کے لیے شکست اور مکمل شکست کے سوا کچھ نہیں۔ ایسی قوموں کا فنی ثقافتی اور تہذیبی انحطاط ایک ایسا خلا پیدا کرتا ہے جو مثبت سوچ رکھنے والی ترقی پسند قومیں پورا کرتی ہیں کبھی سیاسی اور کبھی ثقافتی غلبے اور تسلط کے ساتھ۔ ہمیں کسی غلط فہمی اور زبانی جمع خرچ کے بغیر ایک ترقی پسند قوم بننا ہے۔ برصغیر میں تاریخ کا سبق یہی ہے کہ ترقی پسند قوموں کے لیے یہاں ہمیشہ کرسی خالی رہی ہے۔ ہمیں محنت کرنی چاہیے اور وقت کا انتظار کہ جو بات آج افسانہ نظر آتی ہے کل حقیقت بھی بن جاتی ہے۔

اس وسیع تر نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ہمیں نیشنل کالج آف آرٹس اور اس کے فلسفہ تعلیم کو ایک جدید انداز میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمیں ثقافتی محاذ پوری طرح سونپ دیا

جائے؟ یہی وہ ادارہ ہے جس نے ظلمات میں چراغ روشن رکھا ہے۔ اس خطہ ارض میں فن اور فنکار کو مرنے اور ختم ہونے نہیں دیا۔ ہمارے خیالات اور ہماری امیدوں کی پناہ گاہ بنا رہا۔ آج وقت آ گیا ہے کہ ملبے کے اس ڈھیر سے جواہرات تلاش کر لیے جائیں۔ ہمارا کام ایک مرحلے سے گزر گیا ہے۔ سو سال سے یہ ادارہ قائم ہے۔ یہ مرحلہ اسے فنی و ثقافتی پہچان دینے کا تھا، ہم نے یہ عرصہ محنت اور محبت کے سہارے کامیابی سے گزارا اور جو امانت ہمارے سپرد ہوئی تھی اس کی حفاظت کی۔ فن میں قومیت اور عوامی خدمت کا تصور زندہ رکھا اور آج جب قوم کو اس تصور اس سرمائے کی ضرورت ہے تو ہم اسے قوم کے سپرد کرتے ہیں تا کہ وہ اس چنگاری سے وہ قندیلیں روشن کرے جو اس مایوسی اور ناامیدی کے اندھیرے کو دور کر دیں۔

آج نیشنل کالج آف آرٹس کو نیشنل کلچرل ہیڈ کوارٹرز ہونا چاہیے۔ نیشنل آرٹ یونیورسٹی ہونا چاہیے۔ نیشنل کلچرل ریسرچ سنٹر ہونا چاہیے۔ اگر اب تک ایسا نہیں ہوا تو یہ ہماری بدنصیبی ہے اور ہماری قومی ترجیحات میں خامیوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس صورتِ حال کو درست کرنا چاہیے۔

نیشنل کالج کو ابھی تک انجینئرنگ یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی کے مقابلے میں شاید سیکنڈ کلاس آرکیٹیکٹ، مصور اور ڈیزائنر پیدا کرنے کے لیے قائم رکھا گیا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس شعوری کوشش کے باوجود یہاں سے جو فنکار فارغ التحصیل ہوئے ہیں انہوں نے اپنی محنت اور ریاضت سے اپنا مقام بنایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیشنل کالج آف آرٹس کو بند کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں تا کہ کوئی مقابلہ باقی ہی نہ رہے۔ اب یہ وقت آ گیا ہے کہ اس کے شعبہ فن تعمیر کو انجینئرنگ یونیورسٹی کے شعبہ فن تعمیر میں مصوری اور ڈیزائن کے شعبہ کو پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فنون لطیفہ میں ضم کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔

یہ سب کچھ اس وجہ سے بھی ہے کہ ہمارے کالج کی کمزوریاں اور یہاں کے ذمہ دار لوگوں کی بدعنوانیاں سامنے آ رہی ہیں۔ اس وقت زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ماضی کی راکھ کریدنے سے زیادہ مستقبل میں جو ہونے والا ہے اس میں اپنا حصہ متعین کریں۔ نیشنل کالج آف آرٹس کی تنظیم نو ہونی چاہیے۔ اب عوام کے اس دور میں پرانا نیشنل کالج آف آرٹس برائے کارکنان امراء ختم ہو چکا۔ اس قسم کے کالج کا اب کوئی جواز نہیں۔ فنی اداروں کی کثرت سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ فن کاروں میں بھی طبقے اور قسمیں پیدا کی جائیں۔ ہم نے کسی اور زاویے سے سوچنا ہے اور کام کرنا ہے چنانچہ اس کالج کو اچھا وقت گزارنے کا کلب نہیں سمجھنا چاہیے۔

نیشنل کالج آف آرٹس کو ایک ایسا ادارہ بنایا جائے جہاں ابتدائی سے اعلیٰ درجات تک فنون کی تعلیم و تربیت دی جائے۔ پوسٹ گریجویٹ اور ریسرچ کے لیے شعبہ جات قائم کیے جائیں۔ عوام اور حکومت کے درمیان ثقافتی اور فنی رابطہ کے لیے استعمال کیا جائے۔ ملک کے تمام علاقوں اور تمام طبقوں سے یہاں طالب علم آئیں۔ یہاں سے عوام کے لیے فنی شاہکار تیار ہوں۔ عمارات کے منصوبے تیار کیے جائیں اور قومی زندگی کے تمام پہلو مدنظر رکھ کر حکومت یا عوامی سرپرستی کے تحت کارآمد فنی خدمات سرانجام دی جائیں۔ اسی طرح کے مزید فنی و تحقیقی تربیت کے ادارے قائم کیے جائیں جن کے لیے ماہرین کی ایسی تعداد تیار کی جائے جو نیشنل کالج آف آرٹس سے مزید تعلیم و تربیت حاصل کریں۔

اس قومی ادارے میں فن تعمیر، مصوری اور ڈیزائن کے علاوہ مزید شعبوں میں تعلیم کا انتظام کیا جائے جو ثقافت کی ذیل میں آتے ہیں۔ یہاں فلم، ڈرامہ، ٹیلی وژن یعنی ابلاغ عامہ اور موسیقی کے شعبہ جات بھی شروع کیے جائیں۔ لوک فن کی اکیڈمی قائم کی جائے جو ملک کے اس بیش قیمت خزانے کو جمع کرے، تحقیق کرائے اور ایک ذخیرے کی صورت میں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کرے۔ یہاں پاکستان میں رہنے والوں کی زندگی اور تہذیب و ثقافت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے سرگرمیاں ترتیب دی جائیں۔ بیرونی ممالک میں پاکستان کے ثقافتی تشخص اور پاکستان کے فنی و تہذیبی ورثے کے ذریعے ہمارے مطالبات کو صحیح اور مدلل انداز میں پیش کرنے کے لیے منصوبے بنائے جا سکتے ہیں۔ یہاں کے استاد اور یہاں کے طالب علم قوم و ملک کی امانت کے طور پر عزت کے مستحق قرار دیئے جائیں۔

غیر ممالک میں پاکستانی سفارت خانوں میں یہاں کے سند یافتہ اور غیر معمولی کارگزاری دکھانے والے فن کار مناسب تربیت کے بعد ثقافتی سفیر (Cultural Attache) کے طور پر تعینات کیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے دور افتادہ دیہات بھی منتظر ہیں کہ فن کار وہاں جائیں تاکہ وہ کچھ سیکھ سکیں اور کچھ سکھا سکیں۔

یہ تو میری چند معروضات تھیں جو تجاویز کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کی گئیں۔ اس کے علاوہ کچھ مقامی اور ضمنی قسم کے مسائل ہیں جن سے پہلو تہی نہیں کی جا سکتی لیکن انہیں عظیم مقاصد کے نعم البدل کے طور پر قبول نہیں کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر طالب علموں کی مالی مدد، مصوری وغیرہ کا سامان ارزاں نرخوں پر مہیا کرنا، کالج بس کا اجرا، کینٹین کی عمارت، ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ ڈیزائن کا تقرر، میڈیکل فنڈ، سکالرشپ، رزلٹ وغیرہ اہم ہونے کے باوجود ترجیحات کی صف میں آگے نہیں آسکتے۔ اس وقت

اور مطالبات زیادہ اہم ہیں۔ کیا ہم یہ سب کچھ اس صورت میں حاصل نہیں کر سکتے کہ ایک آزاد نیشنل یونیورسٹی قائم کردی جائے۔

مجھے توقع ہے کہ رکاوٹیں ضرور کھڑی کی جائیں گی، خلوص کا امتحان ضرور لیا جائے گا اور ہم چند دیوانوں کی آواز کو اوپر پہنچنے سے روکا جائے گا۔ لیکن ہمارا وفد اسلام آباد جائے گا تاکہ یہ مطالبہ وزیر تعلیم اور وزیر منصوبہ بندی کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ ہمارے اساتذہ کرام بھی اس مرحلے میں ہمارے ساتھ ہیں لیکن فی الحال گفتگو طالب علموں اور حکومت کے درمیان ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ نیشنل کالج آف آرٹس کی انتظامیہ ہمارا ساتھ دے ورنہ وہ کالج سے محبت اور تعلق رکھنے والوں کا اعتماد کھو بیٹھیں گے۔

ooo

رضوان عظیم پیشے کے لحاظ سے ماہر فن تعمیر ہیں۔ ادب اور تاریخ کے مستقل
طالب علم بھی رہے ہیں۔ نیشنل کالج آف آرٹس میں 1972ء تک تعلیم حاصل
کی اور 1996ء میں اپنی تحقیقی اور پیشہ ورانہ خدمات کے اعتراف میں اس درس
گاہ کے اعزازی ایسوسی ایٹ بنائے گئے۔ لاہور کی تاریخ اور فن تعمیر پر مختلف
قومی اور بین الاقوامی یونیورسٹیوں میں لیکچر دیئے اور گزشتہ تیس سال سے تحقیق و
تدریس سے منسلک ہیں۔ یہ مضامین ان کے ابتدائی دور کی تحریریں ہیں۔
9 789699 739460
Jumhoori Publications